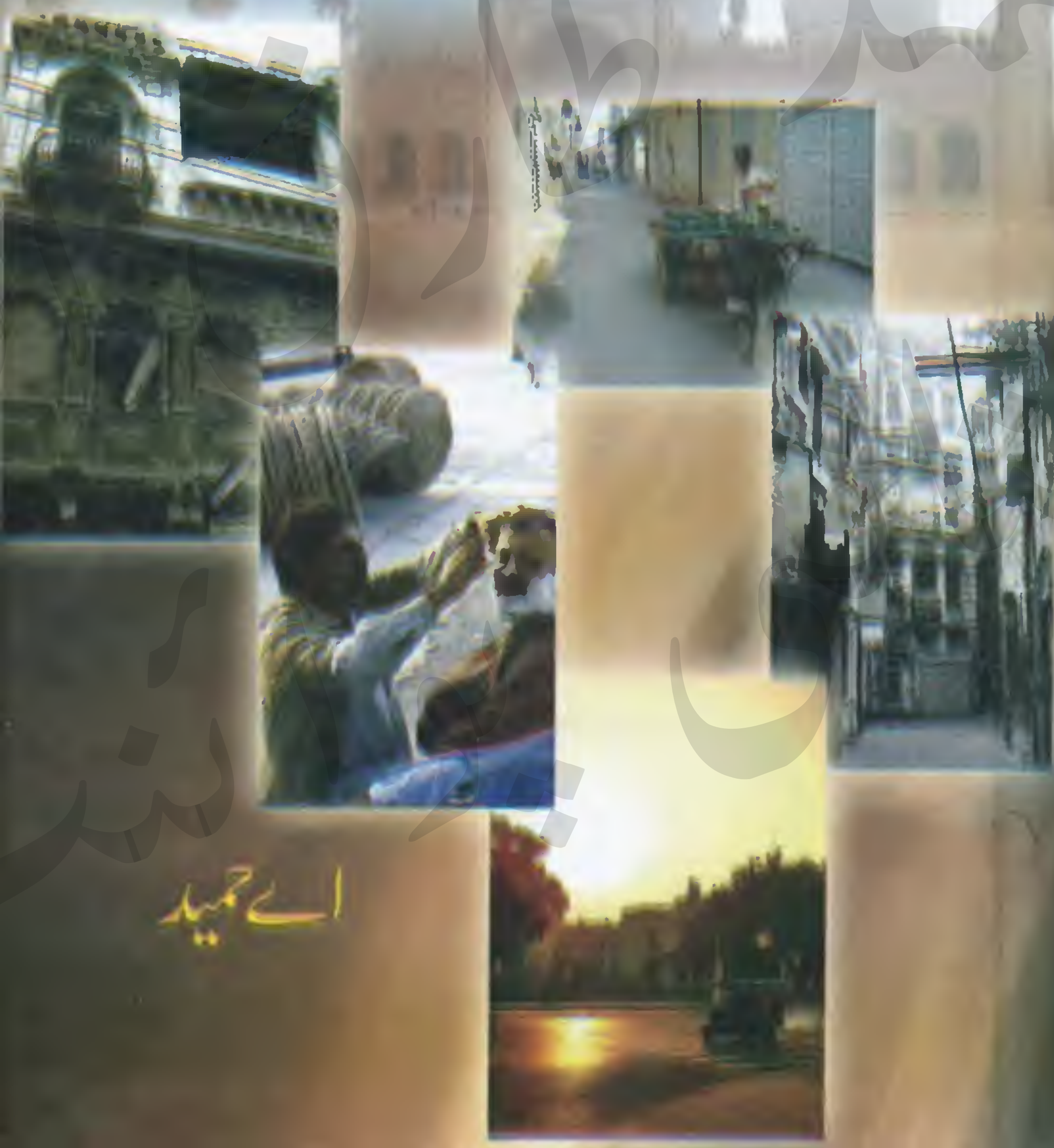
لاہور کی باتیں

کچھ نئی کچھ پرانی



اے حمید

طاہر لاہوری کے نام

2008ء

اہتمام ملک مقبول احمد
سرورق الیمس یعقوب
ناشر مقبول اکیڈمی
مطبع خورشید مقبول پریس
قیمت 200 روپے

MAQBOOL ACADEMY
Chowk Urdu Bazar, Circular Road, Lahore.
Ph: 042-7324164, 7233165 Fax: 042-7238241

10-Dayal Singh Mansion, The Mall, Lahore.
Ph: 042-7357058 Fax: 042-7238241
Email: mqbook@brain.net.pk

فہرست

نومبر کی ایک رات

موسم سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ رات کو اچھی خاصی سردی پڑتی تھی۔ ہم کچھ دوست شہر کے اندر ایک ہوٹل میں بیٹھے روز کی طرح چائے وغیرہ پی رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے رات کے دس بج چکے تھے۔ اگرچہ بازاروں میں لوگوں کی آمد و رفت کم ہو گئی تھی لیکن ہوٹل میں خوب رونق تھی۔ ادھر اُدھر میزوں پر لوگ خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ ایک صاحب اپنے ساتھی سے جاپان کا ذکر فرماتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ جاپان بھی عجیب ملک ہے جب بھی یاد آتا ہے۔ جیب سے ایک ہوک اٹھتی ہے اور بٹوے کی آنکھ میں آنسو آجاتے ہیں کیسا عوام پرور ملک ہوا کرتا تھا۔ انڈی پن اگر آنے میں ملتا ہے تو جرابوں کا جوڑا چار آنے میں آجاتا تھا۔ جرمنی کی مشین اگر ہزار روپے میں آتی تھی تو ہو بہو ویسی ہی جاپانی مشین ایک سو میں مل جاتی تھی۔ وہ بھی کیا دن تھے کہ ہر شے قسطوں پر دست یاب ہوتی تھی۔ کیا سنگر مشین کیا ریڈیو۔ اب تو چیزیں باقی رہ گئی ہیں اور قسطیں غائب ہو گئی ہیں۔ ساتھی بولا۔

"اب تو وہ زمانہ آگیا ہے کہ غریب آدمی تو بالکل زمین کے ساتھ لگ گیا ہے۔"

پہلے آدمی نے کہا۔" سنا ہے رائل پارک میں کوئی کمپنی قسطوں پر سائیکلیں دیتی ہے؟ اسکے

ساتھی نے بے دلی سے کہا'' کوئی کمپنی ایسی تلاش کرو جو قسطوں پر روپے دے یعنی جو رائل پارک والی کمپنی کو ہماری طرف سے قسطیں ادا کر سکے۔''

جس جگہ ہم دوست بیٹھے تھے وہاں ہمارے قریب ہی کیبن کے اندر کوئی ادب دوست صاحب اپنے ساتھی کو ملک میں ادب و آرٹ کی بے قدری کا حال سنا رہے تھے۔''

''دوسرے ممالک میں فنونِ لطیفہ کے دائرہ میں بہت سی چیزیں آجاتی ہیں اور ہمارے ہاں فنونِ لطیفہ کسی چیز کے دائرہ میں نہیں آتا۔ ہمارے ہاں پہنچتے پہنچتے فنونِ لطیفہ اس قدر لطیف ہوگئے ہیں کہ بالکل دکھائی نہیں دیتے''۔

''میرے خیال میں ہمارے ہاں فنونِ لطیفہ سے مراد ہنسانے والے فنون سے لی جاتی ہے۔''

الٹے ہاتھ والے کیبن کے ساتھ ایک دوسرے کیبن میں ایک دوسرے صاحب جو گرم حمام کا کام کرتے تھے اور کبھی کبھی افسانے اور ناول بھی لکھا کرتے ہیں اپنے ایک پنواڑی شاعر دوست کو اپنا تازہ افسانہ سنا رہے تھے۔ افسانہ یوں شروع ہوتا تھا۔

غلام علی ہوٹل سے نکل کر بازار میں آگیا۔ بازار میں اکا دکا لوگ چل پھر رہے تھے گویا بادل نخواستہ بال کٹوانے جا رہے ہوں۔ اچانک کسی مسجد میں اذان ہوئی اور غلام علی کو اپنی محبوبہ اللہ رکھی کا خیال آگیا۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ غلام علی سوچنے لگا۔ اللہ رکھی کی باتیں کتنی پراسرار ہوتی ہیں۔ ان میں کتنی سرگوشیاں ہوتی ہیں جیسے باریک مشین سے حجامت بنائی جا رہی ہو۔ اس محبت کے استرے کی دھار کتنی تیز ہے اس کے جذبات کا حمام کس قدر گرم ہے ـــــ غلام علی کو ایک لمحے کے لیے ساری دنیا ایک غسل خانہ معلوم ہوئی اللہ رکھی! پیاری اللہ رکھی ـــــ شہد کی مکھی! اس خیال کے ساتھ ہی اسکے دل کے بالوں میں محبت کی کنگھی پھیرنے لگی۔

آہ! غلام علی ـــــ چھوٹے غلام علی! بڑے غلام علی!! تیری اللہ رکھی اللہ کو پیاری ہوگئی آج تیرے جذبات کے سیلون میں حجامت کا ریٹ سستا ہوگیا ہے۔ آج تیرے گرم حمام کا پانی ٹھنڈا پڑ گیا ہے اور تیرے احساسات کی شیو بڑھ آئی ہے۔ اور تیری شیو کے جذبات

''......

پنواڑی سامع بولا'' یار یہ تو بڑا ابرابر کا افسانہ ہے''

تھوڑی دیر بعد جب افسانہ ختم ہوگیا تو ناول کے فن پر گفتگو ہونے لگی۔

''ناول کا فن کسی کو اتنی اجازات نہیں دیتا کہ وہ اپنی ہیروئن کے ساتھ بے جا سلوک کرے۔ اسے مارے پیٹے۔ رات گھر سے باہر رکھے اور آخر میں اسے قبرستان (میانی صاحب) میں دفن کرے۔

''مگر بھائی صاحب ناول اور افسانے میں کیا فرق ہے؟''

وہ بولا۔ ''فرق بڑا صاف ہے''

''کیا صاف ہے؟''

''یہی ناول پانچ سو صفحات تک لکھا جا سکتا ہے اور افسانہ ایک صفحے میں بھی آسکتا ہے''

پنواڑی بولا۔ ''لیکن اس وقت بگلے کی ایک ڈبی نہیں آسکتی؟''

اس کو دھکا سا لگا۔ آسکتی ہے لیکن تمہیں باہر سردی میں جانا پڑے گا''

پنواڑی کہنے لگا۔ ''باہر جا سکتا ہوں لیکن پھر اندر نہیں آؤں گا۔''

''تو پھر ثابت ہوا زمین گول ہے اور گائے کے سینگوں پر کھڑی ہے''

پنواڑی نے پوچھا۔ ''لیکن بھائی صیب! وہ بھینس کہاں کھڑی ہے؟

اور یہ دونوں ''فنکار'' اپنی فلسفیانہ باتوں میں مشغول رہے۔ اس ہوٹل کے ہر کیبن میں سردیوں کی راتوں کو فلسفے پر باتیں ہوتی ہیں۔ اس رات بھی ہر کیبن گرم تھا اور ہم تین چار دوست بھی اپنی اپنی کرسیوں پر اکڑوں بیٹھے بڑے گرم تھے کہ ہمارے ایک دوست کو جانے کیا سوجھی کہ اپنی کرسی پر اچھل کر بولے۔

''پنچولی اھذ وڈیو'' میں آج شوٹنگ ہے۔

''پھر؟''

''پھر آج شوٹنگ دیکھی جائے۔

ہمارے ایک تجربہ کار ساتھی پوچھنے لگے۔ شوٹنگ ڈائیلاگ کی ہے یا ڈانس کی؟۔

جب پتہ چلا کہ ایک خوب صورت ڈانس فلمایا جائے گا۔ تو سبھی دوستوں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ آج رات سردی ہے پھر کیوں نہ گرم گرم قالین پر پڑتے ہوئے گرم گرم پاؤں اور گوری گوری پنڈلیاں دیکھی جائیں۔ لالی سیٹھ نے سگریٹ بجھا کر حکیم صاحب سے پوچھا۔

کیوں حکیم جی ! ناچنے والی کی پنڈلیوں کی تاثیر کیا ہے؟''

حکیم جی کھنکار کر بولے۔ ''گرم تر''

اس فیصلے کے بعد کہ شوٹنگ ضرور دیکھنی چاہیے۔ ہم لوگوں نے ایک تانگہ کرائے پر لیا اور نہر کے پل کی طرف روانہ ہو گئے۔ سردی بڑھ گئی تھی اور سرد ہوا میں جسم ٹھٹھرنے لگے تھے۔ لالی سیٹھ نے ٹمپل روڈ پر تانگہ کھڑا کروالیا۔ گھر گیا اور سوئی ہوئی بیوی کے اوپر سے گرم کمبل کھینچا اور بھاگ کر پھر تانگے میں آگیا۔

''چلو دوستو آج تو کمبل بھی گرم تر معلوم ہو رہا ہے۔''

جس وقت ہماری منڈلی سٹوڈیوز میں پہنچی۔ شوٹنگ شروع ہونے ہی والی تھی ایکٹر لوگ میک اپ کر رہے تھے۔ بہت جلد اس روح فرسا خبر کا انکشاف ہو گیا۔ کہ ڈانس کوئی نہیں ہے۔ صرف ''ڈائیلاگ'' فلمائے جائیں گے۔ لالی سیٹھ زمین پر بیٹھ گیا۔ حکیم صاحب پر غشی کی سی حالت طاری ہو گئی اور ہمارے تجربہ کار ساتھی نے انگلی ہوا میں گھماتے ہوئے ان کی ہمت بندھائی۔

حوصلہ مت ہارو دوستو! اب آ گئے ہیں تو کچھ نہ کچھ دیکھ کر ہی جائیں گے خواہ ڈانس ہو خواہ بن مانس''

بادل نخواستہ سب دوست سٹوڈیوز کے چائے خانے میں کرسیوں پر بیٹھ گئے سامنے سٹوڈیوز کے اندر بڑی تیز روشنی ہو رہی تھی اور ڈائریکٹر کی اونچی آواز میں میزوں کرسیوں الماریوں کو

ادھر ادھر کھسکانے کی آوازیں مخلوط ہو رہی تھیں۔ پرلی جانب درختوں کے پاس ایک کمرے (میوزک روم) میں سے سازوں کی موسیقی کی آوازیں آرہی تھی چائے خانہ کی ایک میز پر فلم کا ہیرو اور کیمرہ مین دونوں کھانا کھا رہے تھے۔ ہیرو بوٹیاں نکال کر بار بار کیمرہ مین کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔

''لیجئے یہ کھایئے۔ یہ ذرا نرم ہے''

اور کیمرہ مین ان بوٹیوں کے کلوز اپ لے بغیر ہی انہیں نگل رہا تھا۔ ایک اور ایکٹر بادشاہ کا زرق برق لباس پہنے سر پر بناوٹی ہیروں کا تاج رکھے۔ دسوں انگلیوں میں نقلی چمکدار موتیوں کی انگشتریاں سجائے اندر تشریف لائے اور کرسی پر بیٹھتے ہی بولے!

''لیاو اوئے خیرے! اج بادشاہ آپ آگیا ہے''

خیرے نے کہا چائے ضرور پی لو مگر ادھار نہیں ہو گا۔

بادشاہ جلال میں آ گئے۔ کوئی گل نہیں جناب شاہ جی ڈائریکٹر سے دونی ' ایڈوانس لے کر دے دیتا ہوں تم ذرا چائے پاؤ سرکار جی!''

اس کے بعد انہوں نے کچھ دیر کے ہیروئین کو دیکھا اور پھر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر لمبی جماہی لی اور بولے ''یادا تا بچا اپنی نگری سے'' کیمرہ مین نے انگلیاں چاٹتے ہوئے کہا:

''یار کیا بات ہے اتمہارے کردار میں بادشاہوں جیسا رعب نہیں ہے''

بادشاہ بیڑی سلگاتے ہوئے ذرا مسکرایا۔

''سرکار جب بادشاہ کا پارٹ دینے کے بعد ڈائریکٹر کہتا ہے تا کہ کل شوٹنگ ہے اور بس پر بیٹھ کر آجانا اور جیب میں بس کا کرایہ نہیں ہوتا تو پھر رعب اپنے آپ ہوا ہو جاتا ہے۔''

سین شوٹ ہونے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا تاہم لوگ میوزک روم میں آ گئے کسی گانے کی ریہرسل ہو رہی تھی۔ گانے والی طوائف درمیان میں بیٹھی تھی اور میوزک ڈائریکٹر کلارنٹ کی پی پر دھاگہ لپیٹ رہے تھے۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہو چکے تھے تو سب کو چپ کرا بازو

اٹھا کر بولے۔

''لو بھئی ایک بار اپنے اپنے استاد کا نام لے کر ذرا اللہ کو یاد کرو اور ریڈی ہو جاؤ۔

ون. ٹو. تھری کے بعد تمام ساز ایک دم شروع ہو گئے۔ میوزک ڈائریکٹر کے دونوں بازو ہوا میں لہرانا شروع ہو گئے۔ اپنے آپ ہی انہیں محسوس ہوا کہ وائلن والا ایک سر نہیں لگا رہا۔ انہوں نے بازو ہلاتے ہلاتے اسی طرح سازوں کے شور میں زور سے آواز دی۔

''صادقا! باز آ جا تیری............''

جب صادق پھر بھی باز نہ آیا تو میوزک ڈائریکٹر نے ساز بند کروا دیئے اور صادق کے سامنے جا کر بیٹھ گئے۔

''وجا اوئے ایہہ پیو نوں''

صادق نے وائلن بجایا۔ بیچ میں کسی جگہ میوزک ڈائریکٹر چیخ پڑے۔''

یہ نکھار تیری ماں لگائے گی صادقا! اوئے.........''

تین چار مرتبہ کی ریہرسل کے بعد صادق نے نکھار بالکل درست لگایا۔ تو میوزک ڈائریکٹر کا کچھ سر بل گیا۔ ہائے ظالما! روح کڈھ لیا ای''

ریہرسل ختم ہوئی تو کوئی سازندہ آگ تاپنے لگا۔ کسی نے بیڑی سلگائی اور کوئی دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایک کلارنٹ والے کو جانے کیا سوجھی کہ آپ گانے والی موٹی گوری طوائف کے گورے گورے بازو کے ساتھ اپنی کالی کلوٹی کلائی ملا کر بولے۔

''ایسے لگتا ہے جیسے نان پر کباب رکھا ہو''

خدا خدا کر کے فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی۔ اس کے باوجود کوئی چیز ٹھیک وقت پر نہ ہو رہی تھی۔ ڈائریکٹر سگریٹ ہاتھ میں سلگائے کبھی ہیرو کو آواز دیتا تھا اور کبھی ہیروئن کی ماں کو پکارتا تھا۔

اب بھیج دو اپنی لاڈلی کو ہائی جی''

جب سین کا ''کورم'' پورا ہو گیا تو شوٹنگ کی پہلی ریہرسل شروع ہوئی۔ منظر یہ تھا کہ ہیرو اپنی

ہیروئن کے ساتھ کمرے میں بیٹھا ستو پی رہا تھا کہ ایک غنڈا چاقو ہاتھ میں لہراتا اندر داخل ہوتا ہے اور ہیرو کی طرف اس چمکدار چاقو کا پھل تان کر آنکھیں مست بنا کر پکارتا ہے۔

''آج میں تم سے سودا کرنے آیا ہوں''

ہیرو نے ڈائریکٹر سے کہا ''تو پھر میں اداس بیٹھوں نا''

''ہاں تم اداس ہو گے اور ہیروئن بھی اداس ہو گی۔ ستوؤں کا گلاس بھی اداس ہو گا۔

غنڈہ بولا۔ ''پھر تو میں بھی اداس ہوں گا۔''

ڈائریکٹر چیخ اٹھا ''او کامیاں بک بک بند کرا وئے''

ہیرو:۔ ''تو پھر اس کے ہاتھ میں چاقو ہو گا؟''

ڈائریکٹر:۔ ہاں چاقو ہو گا۔ کھلا ہوا چاقو۔''

ہیرو:۔ اور وہ کیا کرے گا؟''

ڈائریکٹر:۔ (بکری کی طرح سکڑ کر) وہ چاقو گھونپ دے گا۔

ہیرو:۔ (ڈر کر) کہاں؟''

ڈائریکٹر:۔ ''تمہارے بغل والے سرہانے میں''

جب منظر فلمایا جانے لگا تو عین موقعے پر غنڈے سے چاقو نہ کھل سکا۔ جب دوبارہ فلمایا جانے لگا تو چاقو کھل گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی غنڈے کا صافہ بھی کھل گیا۔ ڈائریکٹر پھر چیخا۔''

''اسے اتار دو۔ اسے اتار دو گے؟''

''اتار دو؟''

''سائی لنس۔ کٹ۔۔''

غنڈے کو چاقو کھولنے سے پہلے کہنا تھا۔'' آج میں تم سے سودا کرنے آیا ہوں۔ جب منظر تیسری مرتبہ فلمایا جانے لگا تو اس کے منہ سے اپنے آپ نکل گیا۔''

''آج میں تم سے سودا کرنے آیا ہوں۔

ڈائریکٹر نے چیخ مار کر کہا:۔

''وہ تمہارا پو چھلیاں نہیں بیچ رہا۔

چنانچہ غنڈہ تمام رات چاقو کھول کھول کر سودا خریدتا رہا اور فلم کٹ کرواتا رہا۔ آخر کار ڈائریکٹر سر پیٹ کر بیٹھ گیا۔

''ارے گامی!

کہہ دو میں کچھ نہیں خریدنے آیا۔''

لیکن وہ کیسے کہہ دیتا وہ تو سودا خریدنے آیا تھا۔ ہیرو سے ستو خریدنے آیا تھا۔ اور یہ چکر رات بھر چلاتا رہا یہاں تک کہ دو بج گئے۔ اور ہم لوگ واپس ہو لیے۔ واپسی پر ہمیں جس گڈھے پر جگہ ملی اس پر مولیاں لدی ہوئی تھیں اور سبزی منڈی کی طرف جا رہا تھا۔ اچھرہ پہنچ کر اس گڈے کا ایک پہیہ زور سے چرچرایا اور گڈا ایک طرف سے سڑک کے ساتھ مل گیا۔ گڈھے کا ٹھیک ہونا بڑا مشکل تھا۔ ہم نے مولیاں ہاتھوں میں پکڑیں اور انہیں کھاتے ہوئے شہر کی طرف مارچ شروع کر دی طے یہ ہوا کہ آدھا راستہ ہنسانے والے لطیفے ہوں اور آدھا راستہ ٹریجک لطیفے ہوں۔ یعنی جن میں کسی نہ کسی ٹریجڈی کا ذکر ہو۔

ڈیڑھ میل چلنے کے بعد جب ٹریجک لطیفے شروع ہونے لگے تو حکیم صاحب نے اپنے کوٹ کی جیب میں کچھ ٹٹولتے ہوئے کہا۔

صاحبان! ذرا ٹھہریئے مجھے ایک ٹریجڈی یاد آ گئی ہے۔

''وہ کیا ہے؟'' سب نے پوچھا۔

''وہ یہ کہ سگریٹ کی ڈبیہ گڈے میں ہی رہ گئی ہے۔''

سگریٹ گڈے میں رہ گئی تھی۔

اور گڈا اچھرے رہ گیا تھا اور اچھرہ بڑی دور تھا۔

بمبئی سے بھی دور۔

بمبئی۔ دیوکی بوس۔ کیدار شرما۔ اور شانتارام کا بمبئی۔

جہاں سجاد حیدر کا ہیرو دفن ہے۔ اور آرزو لکھنوی کے گیت دفن ہیں اور جہاں کوئی سازندہ نکھار کی جگہ ریکھب نہیں لگاتا۔

کوئی ہیرو کیمرہ مین کو اچھی اچھی بوٹیاں پیش نہیں کرتا۔

اور کوئی چائے والا ''بادشاہ سلامت'' کے چائے مانگنے پر یہ نہیں کہتا کہ ''پہلے اگلا ادھار صاف کریں بادشاہ جی''

وادیاں

ہفتہ کی رات کو پنڈی میں کل پاکستان مشاعرہ تھا۔

اور جمعرات کی شام کو ہم مری میں بیٹھے ایک اہم مسئلہ پر غور وغوض کر رہے تھے۔

یہ اہم مسئلہ مری میں ایک چھوٹے سے مشاعرہ کا تھا یہاں کے ادیبوں نے مل کر کچھ یہ فیصلہ کیا تھا کہ پنڈی آئے ہوئے شاعروں کو مری بلایا جائے اور اتوار کی شام کو ایمبیسیڈر ہال میں چھوٹا سا مشاعرہ ہو جائے۔ میں نسیم اور لطیف، طارق جلیل کی مال پر ریڈیو انجینیر کی دوکان ہے۔ وہ شاعر ہے۔ انجینیر ہے اور موسیقار ہے۔ اس نے ہر پیشے میں ٹانگ اڑا رکھی ہے۔ اور شاید اسی لیے وہ کچھ لنگڑا کر چلتا ہے۔ وہ تھوڑا تھوڑا سب کچھ ہے۔ ریڈیو مرمت کرتے کرتے وہ ایکا ایکی ہیڈفون اتار کر بیٹھ جائے گا۔ اور بانسری پر پہاڑی دھن شروع کر دے گا۔ وہ پہاڑی دھن کی صرف ایک ہی تان جانتا ہے اور وہ اسے بار بار دھرائے گا۔ یہاں تک کہ اس کا سانس پھول جائے گا۔ اور یوں محسوس ہوگا کہ پہاڑی دھن نہیں بجا رہا تھا۔ بلکہ پہاڑوں میں چکر کاٹ رہا تھا۔ جس دن میں مری پہنچا اس کے دوسرے دن اس نے مجھے گھر لے جا کر اپنے بے سرستار پر بھوپالی کی ایسی درگت سنائی کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے بھوپال کے سٹیشن پر بلیاں رو رہی ہیں۔ اس کے دائرمین کا نام چنا ہے جو گوتم بدھ

کے رتھ بان کا نام تھا۔ کبھی کبھی طارق جلیل پر بھی گوتم بدھ کا گمان ہوتا ہے۔ جو کہ وہ مری کے جنگل چھوڑ کر شہر میں آ گیا ہو اور جس نے شہر باس لے لیا ہو۔ جب وہ کبھی ٹیسٹ رپورٹ یا کسی گاہک کا بل بناتے ہوئے اچانک قلم کاغذ ایک طرف رکھ کر طبلہ بجانے لگتا تو میں فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ اس دنیا میں طبلہ بجانے آیا ہے یا ریڈیو مرمت کرنے ویسے وہ ریڈیو بھی اسی طرح مرمت کرتا ہے جس طرح ستار پر بھوپالی بجاتا ہے۔ وہ طارق جلیل نہیں۔ جبل اور طارق ہے۔ جبرالٹر ہے۔ میں اسے جبرالٹر ہی کہا کرتا ہوں۔ نسیم شاعر ہے اور پنجاب کے ایسے علاقے سے تعلق رکھتا ہے جو سکھوں کے لیے مشہور ہے۔ لطیف افسانہ نویس ہے، جو سردیوں میں جب برف گرتی ہے کہانیاں لکھتا ہے۔ اور گرمیوں میں انہیں پڑھتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی سگرٹ نہیں پیتا اور میں حیران ہوں کہ اس کے باوجود یہ افسانے اور غزلیں کیوں کر لکھ لیتے ہیں۔ ہم چاروں جبرالٹر کی دوکان پر بیٹھے تھے۔ نسیم نے کہا''

''میرا خیال ہے شاعروں کے کھانے کا انتظام سیمز میں کیا جائے''

جبرالٹر نے سر کھجلاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ لوگ کتنے ڈنگ روٹی کھائیں گے؟''

میں نے بڑے ادب سے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے کہ احمد ندیم قاسمی بمشکل ایک ڈنگ کھا سکیں گے''

جبرالٹر ہنس پڑا اور اٹھ کر نئے برقی قمقموں کی پیٹی کھولنے لگا۔ جب وہ نصف مال باہر نکال چکا تو جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ چائے کا خالی ٹرے لے کر دہلیز میں بیٹھ گیا اور اسے بجاتے ہوئے سر ہلا ہلا کر کہنے لگا۔

پکے پل تے لڑائیاں ہوئیاں   تے چھویاں دے کل ٹٹ گئے

دوسرے دن مری کا موسم بہت خوشگوار تھا۔ دھوپ نکھری ہوئی تھی اور ڈھلانوں پر مرطوب سبزہ مہک دے رہا تھا۔ میں اور نسیم لوئر مال بازار سے ہو کر گورنمنٹ سکول کی جانب جا رہے

تھے۔ہم مری کے بزرگ شاعر حیدری صاحب سے ملنے جا رہے تھے۔ہم کئی ایک تنگی ٹیڑھی' اونچی' نیچی' گندی' پتھریلی گلیوں سے گذر کر باہر نکلے تو سامنے سفیدے کے درختوں کی قطاروں کے درمیان سکول کی عمارت نظر آئی۔ نیچے گہری وادی میں کہیں کہیں کھیتوں میں رکا ہوا پانی چمک رہا تھا ہوا خنک تھی۔ جو سورج کی تمازت کو زائل کر رہی تھی۔نسیم نے حیدری صاحب سے تعارف کروایا جو ہمیں ہال کمرے میں لے آئے۔جب مشاعرے کے متعلق سب امور طے ہوگئے تو ہم بالکونی میں آ کھڑے ہوئے۔حیدری صاحب نے ایک ادھیڑ عمر ماسٹر صاحب کو روک کر کہا۔

''مشاعرے کے لیے تیار رہنا مولانا''

مولانا نے بڑے پرشوق لہجے میں پوچھا۔

''کیا زہرہ نگاہ بھی آ رہی ہیں؟''

''ضرور آ رہی ہیں۔''

اس پر ماسٹر صاحب نے باہیں پھیلا کر'' آہ آہ'' کیا اور آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پونچھنے لگے۔حیدری صاحب بولے۔

دس روپے چندہ آپ کے نام لکھ دیا گیا ہے۔

ماسٹر صاحب چوکنے ہوگئے اور ہائے ہائے آہ آہ کرتے وہاں سے بھاگ گئے۔اسکول کی گراونڈ چھوٹی سی ہے۔جس کے سامنے بوچڑ خانہ ہے۔اتوار کو قصاب گراونڈ میں جمع ہو کر دنبے لڑاتے ہیں اور ڈھول تاشے بجاتے ہیں۔جس جگہ ہم کھڑے تھے نیچے فارسی کے ماسٹر نے کلاس لے رکھی تھی۔ایک لڑکا فارسی کے شعر پڑھ رہا تھا اور ماسٹر صاحب اس کا مطلب سمجھا رہے تھے۔

''اس کا مطلب ہے کہ اے خدا مسلمانوں کو پھر ایک دوسرے کا درد بخش دے اگر مسلمانوں میں درد ہوتا تو یہ سامنے والی مسجد کا مینار عرصے سے غیر مکمل نہ پڑا ہوتا درد کے نیچے نشان

لگاؤ۔''

حیدری صاحب مشاعرے کا ٹکٹ لگانا چاہتے تھے اور گورنمنٹ ٹکٹ پر ٹیکس لگانا چاہتی تھی اور لوگ مشاعرہ مفت سننا چاہتے تھے۔ میں نے نسیم کو مشورہ دیا۔کہ مسٹر جبرالٹر کے گلے میں ڈھول لٹکا کر مری کی سڑکوں پر ایک جلوس نکالا جائے اور چیخ چیخ کر لوگوں کو سنایا جائے کہ آ گیا۔آ گیا۔ایک عرصہ کے بعد آپ کے شہر میں آ گیا۔صرف دو آنے میں ظہیر کاشمیری دیکھو۔قمر اجنالوی اور قتیل شفائی دیکھو ساتھ ہی چوہدری نذیر بھی دیکھو۔ایک ٹکٹ میں دو مزے مردہ شاعروں کا زندہ مشاعرہ آ گیا۔آ گیا لاہور سے پنڈی اور پنڈی سے مری آ گیا۔

مسٹر جبرالٹر کا خیال تھا کہ اسی طرح پبلسٹی کرنے سے کوئی نہیں آئے گا۔بہتر یہی ہے کہ لوگوں کو اندھیرے میں ہی رکھا جائے۔اندھیرے میں یہ لوگ زیادہ گرم جوشی کا ثبوت دیتے ہیں۔مگر نسیم نے کہا۔

''یار ظہیر کاشمیری کی ناک بڑی خوب صورت ہے۔''

لطیف نے کہا۔

''مگر وہ آگے سے مڑی ہوئی کیوں ہے؟''

جبرالٹر بولا'' وہ ناک کروکٹ ہے۔''

میں نے کہا۔

ہاں وہ کروکٹ ہے۔بنسی کی طرح ہے۔پچھلے سال ہم راوی پر گئے تو ظہیر کاشمیری نے ڈبکی لگائی اور جب باہر نکلا تو اس کی ناک میں مچھلی پھنسی ہوئی تھی۔

جبرالٹر سر ہلا ہلا کر ہنسنے لگا۔اس کے سر میں سیکری ہے اور ہر وقت سر کھجلاتا رہتا ہے۔کسی وقت وہ اس قدر زور زور سے سر کھجلاتا ہے کہ محسوس ہوتا ہے اس کے سر میں سیکری نہیں فتح پور سیکری ہے۔مشاعرے کے اشتہارات لکھے جانے لگے تو ارمان فارانی نے کہا:۔

زہرہ نگاہ کا نام اوپر لکھو اور اس کے ساتھ محترمہ ضرور لکھو۔ اس طرح عورتیں زیادہ آ گئیں"

ارمان فارانی کو زیادہ عورتوں سے بڑی دلچسپی ہے۔ وہ بے حد دبلا پتلا اور کمزور ہے۔ اور ہر سال ایک بچہ پیدا کرتا ہے۔ اور اناج کی مہنگائی پر غزلیں کہتا ہے۔

ہم کینٹے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ممتاز اپنے مسکین صورت ساتھی کے ہمراہ داخل ہوا یہ لوگ شام کو بری امام کے میلے پر جا رہے تھے۔ ممتاز اپنے ساتھ مجھے بھی لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں لاہور نہ جاؤں اور بری امام کا میلہ ضرور دیکھوں۔ میں نے سوچا کہ پنڈی کا مشاعرہ بھی سنیں گے اور میلہ بھی دیکھ لیں گے اور پھر شاعروں کو لے کر مری آ جائیں گے چنانچہ میں تیار ہو گیا۔

پورے چار بجے سہ پہر ہم بادامی رنگ کی جیپ میں سوار ہوئے اور ایبٹ آباد جانے والی سڑک سے ہوتے ہوئے پنڈی روڈ پر آ گئے۔ ہم کل سات آدمی تھے۔ میں ممتاز۔ نسیم۔ شفیق۔ لطیف اور دو اور صاحب تھے۔ چھرہ پانی جیپ کچھ دیر کے لئے رکی۔ وہاں سے ایک لڑکا جو ڈرائیور کا دوست تھا۔ آن شامل ہوا۔ ممتاز کا خیال تھا کہ جیپ پندرہ میل کی رفتار سے چلنی چاہیئے تاکہ پہاڑی راستے کا لطف اٹھایا جائے۔ نسیم کا خیال تھا پہاڑی راستے کا لطف ہی جب ہے جب جیپ پچاس میل کی رفتار سے جا رہی ہو چنانچہ کبھی جیپ پندرہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی اور کبھی پچاس میل۔ اور لطف دونوں طرح آ رہا تھا۔ میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اور چیڑ کے درختوں سے آنے والی ٹھنڈی اور خوشبودار ہوا سب سے پہلے مجھ سے بغل گیر ہوئی تھی۔ راستے میں کھڑے بڑے بڑے پتھر اور درخت سن کی آواز کے ساتھ گذر رہے تھے۔ نیچے وادیوں میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور جا بجا گندم کے چھوٹے چھوٹے سنہری کھیت چمک رہے تھے۔ پر پیچ پتھریلی پگڈنڈیوں پر کہیں کوئی بوڑھا آہستہ آہستہ اوپر چڑھتے دکھائی دیتا۔

اور کہیں کوئی چرواہن بکریاں ہنکاتی نظر آ جاتی۔

جوں جوں ہم بلندی سے اتر رہے تھے۔ فضا میں ٹھنڈک کم ہو رہی تھی۔ چھتر پہنچ کر جیپ روک دی گئی۔ ممتاز اور نسیم کا خیال تھا کہ یہاں لوکاٹ کھائے جائیں اور بعد ازاں چائے پی جائے۔ چھتر کی لوکاٹیں مشہور ہیں۔ یہاں اس پھل کے بے شمار باغ ہیں۔ جیپ سڑک کے کنارے کھڑی کر کے ہم ایک باغ میں داخل ہو گئے۔ لوکاٹوں کے ان گنت درخت کھڑے تھے۔ جن کی جھکی ہوئی شاخوں پر سنہری اور گیریا رنگ کے لوکاٹوں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ پک کر گرے ہوئے زمین پر بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے ایک خوب صورت اور صحتمند لوکاٹ اٹھائی۔ اس کا رنگ ہلکا کتھئی تھا اور وہ روئیں دار تھی مجھے یوں لگا جیسے میں ایستھر ولیمز کے رخسار پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ نیم گرم بے داغ اور ریشمی رخسار اس بہار کی شیریں مہک اور کھلی ہواؤں کا نکھار تھا۔ مجھے موچی دروازے کی جلی ہوئی گندی اور داغ دار لوکاٹوں کا خیال آ گیا اور میں نے جلدی سے ایستھر ولیمز کو منہ میں ڈال لیا۔ موچی دروازے کی گندی لوکاٹیں مہنگی ہیں۔ وہ خون خراب کرتی ہیں۔ اور چھتر کے باغ میں ان کا رنگ سورج کی کرنوں اور ڈوبتے شفق کا رنگ ہے اور وہ حلق میں شہد انڈیلتی ہیں اور خون صاف کرتی ہیں۔ اور وہ انمول ہیں بیش قیمت ہیں۔ اور یہ کانوں کے بندے ہیں اور پاؤں کے گھنگھرو ہیں اور انہیں پہن کر زندگی رقص کی تال پر دھڑکتی ہے اور بہار کے گیتوں پر ناچتی ہے۔ یہاں موچی دروازہ ختم ہوتا ہے اور لاس اینجلز شروع ہوتا ہے اور پرنالے ختم ہوتے ہیں۔ اور چشمے شروع ہوتے ہیں۔ میٹھے پانیوں کے شفاف اور ٹھنڈے چشمے۔

چھتر کی لوکاٹیں کھاؤ اور چشموں کا پانی پیو اور پھر چھتر کی لوکاٹیں کھاؤ لیکن مالی یہاں بھی درختوں سے پھل توڑنے نہیں دیتے۔ ہم نے ٹوکری میں پڑی ہوئی لوکاٹوں کا سودا کیا اور گھاس پر بیٹھ کر کھانے لگے اور ایک دوسرے پر نشانے باندھنے لگے۔ میں نے دو سیر لوکاٹیں ساتھ لے لیں۔ وہ پنڈی میں اپنی خالہ کے ہاں لے جانا چاہتا تھا۔ پوری طرح رج

کر یعنی سیر ہو کر ہم نے سگریٹ سلگائے۔ جیپ میں بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر بعد جیپ فراٹے بھرتی پنڈی کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

پنڈی پہنچ کر میں تسیم اور لطیف بڑی مسجد کے پاس اتر پڑے۔ دوسرے ہم جیپ ہمیں نو بجے رات ایک خاص مقام پر ملنے کی تاکید کر کے چل دیئے۔ اور ہم احمد ظفر کے گھر آ گئے اور وہاں سارے شاعروں کا ٹولہ پہلے ہی سے موجود تھا۔ سب سے ملاقات ہوئی راہی بھی ملا اور ہم نے نہایت خوب صورت گالیوں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کیا۔ وہ لوگ پنڈی پہنچے ہی تھے اور نہانے کی تیاریوں میں تھے۔ ان میں احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، قتیل شفائی، قیوم نظر، شہرت بخاری، قمر اجنالوی اور احمد راہی بھی تھے۔

سب سے پہلے راہی نہایا اور سب سے آخر میں قاسمی صاحب کی باری آئی۔ ظہیر صاحب نے غسل خانے میں بہت دیر لگا دی۔ پتہ چلا کہ وہ پانی کی دھار تلے سر دے کر ترنم سے اپنی تازہ غزل پڑھ رہا تھا۔ اور خود ہی، مکرر ارشاد ہو کہہ کر اسے بار بار پڑھ رہا تھا۔

راہی شیو بنوانا چاہتا تھا۔ اس نے ظہیر کاشمیری سے کہا۔

''ٹوٹے ہوئے پیسے ہیں؟''

ظہیر نے آنکھیں جھپکا کر کہا

''دس روپے کا نوٹ ہے''

میں اور راہی کسی سیلون کی تلاش میں نکل پڑے۔ ایک جگہ سے گزرتے ہوئے راہی نے کہا۔

''۔۔۔۔۔۔ کا مکان وہ سامنے ہے۔ وہ جس کا چھجا باہر نکلا ہوا ہے۔ اور جس کی منڈیر پر چیل بیٹھی ہے۔ تم اگر یہاں ٹھہرو تو میں اسے مل آؤں۔ فکر نہ کرو صرف سیڑھیوں میں آواز دے کر اور خیر خیریت پوچھ کر ہی چلا آؤں گا۔''

میں نے کہا۔

''تم INSPIRATION چاہتے ہو؟''

اس نے کہا''

''ہاں''

مگر میں نے اسے اجازت نہ دی۔ اس لیے کہ پنڈی میں میری بھی ایک محبت دفن ہے اور میں بھی اس کے مزار پر فاتحہ خوانی کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس کے گھر سیڑھیوں میں آواز نہیں دے سکتا تھا۔ اور خیر خیریت نہیں پوچھ سکتا تھا میرے لیے اتنا انسپائریشن ہی کافی تھا کہ میں بھی اس فضا میں سانس لے رہا ہوں جس فضا میں میری محبت سانس لے رہی ہے چنانچہ ہم سیلون میں داخل ہو گئے شیو بنوا کر جب ہم واپس آئے تو سارے شاعر مکان کے باہر لان میں بیٹھے تھے قمر اجنالوی اپنے بازو میں ٹیکہ لگانے کے لیے سرنج صاف کر رہا تھا۔ جب اس نے بڑی بے تکلفی سے اپنے بازو میں خود ہی سوئی چبھو ڈالی تو ظہیر کاشمیری ناک سکیڑ کر بولا۔

''کرومائین کے ٹیکے تمہیں مار ڈالیں گے۔ یہ ٹیکہ لگانا تم نے کہاں سے سیکھ لیا ہے؟''

قتیل شفائی کو بھی دل میں درد ہو رہا تھا اور وہ سینے پر پلاسٹر لگائے بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد یہ سارا ٹولہ چائے پینے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ راجہ بازار کے جس پہلے ہوٹل میں جا کر بیٹھے وہاں جگہ کم تھی چنانچہ سارے باہر نکل آئے۔ فردوس ہوٹل میں جگہ کافی تھی۔ پہلے کھانا کھایا گیا۔ قاسمی صاحب نے از راہ کرم اپنی پلیٹ کی ساری بوٹیاں مجھے دے دیں اور میں از راہ کرم انہیں دیکھتے دیکھتے کھا گیا۔

راہی میرے سامنے بیٹھا تھا اور میں بڑی صفائی سے اس کی آنکھوں میں خاک جھونک کر اس کی فرنی بھی ہضم کر گیا۔

اس دوران کل پاکستان مشاعرہ والوں میں سے کوئی بھی نہ آیا تھا چائے پر ہنسی مذاق کی باتیں ہوئیں۔ قتیل پوچھنے لگا کہ لفظ چونا ہے یا چوتا ہے۔ قاسمی نے کہا چوتا ہے۔ یعنی ہماری چھت چوتی ہے۔ ظہیر نے کہا۔ چونا ہے۔

جب کافی گرما گرم بحث شروع ہو گئی تو میں نے سب کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی چھت کی مرمت

کروا کر اس بک بک سے نجات حاصل کریں اتنے میں ایک جیپ کار آ کر رکی اور یکے از منتظمین مشاعرہ باہر تشریف لائے ان کا نام مولانا عرفانی تھا۔

وہ ٹھگنے قد کے تھے۔ چہرے پر داڑھی اور آنکھوں پر چشمہ تھا جو خنک تھا۔ اور جس کے کنارے پر کوئی درخت نہ تھا۔ ٹھیک نو بجے ہم سب پنڈال میں پہنچ گئے۔ کہیں باجا بج رہا تھا۔ باہر پولیس تھی اندر پولیس تھی۔ اور درمیان میں گیٹ پر بھی پولیس تھی۔ سٹیج پر قالین بچھے تھے۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔ وہاں پنڈی کے دوسرے دوستوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں، راہی، قمر اور قتیل سٹیج کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ حاضرین کی تعداد کافی تھی۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ سٹیج سیکرٹری نے پہلے شاعر کو بلایا۔

مشاعرہ ریڈیو پاکستان پنڈی ریکارڈ بھی کر رہا تھا۔ چنانچہ ہر شاعر ترنم سے پڑھنے کا خواہش مند دکھائی دیتا تھا۔ خیال تھا کہ پہلا شاعر یونہی سا ہو گا۔

لیکن پہلے شاعر نے چند قطعات پڑھ کر سامعین سے کافی داد وصول کی اور رسید دے کر واپس چلے گئے۔ انجم رومانی آئے تو پیچھے سے آواز آئی۔

''کیا یہ روما سے آئے ہیں؟''

قیوم نظر نے اپنی نظم ''بگل بجا'' پڑھی اور لیفٹ رائٹ کرتے اتر گئے۔

قتیل شفائی نے ایک غزل ترنم سے پڑھی۔ قتیل کو زیادہ تر لوگ اس کے ترنم سے جانتے ہیں۔ اور اس کے ترنم کی بہت تعریف کی جاتی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ انتہائی ناقص پڑھتا ہے۔ ایک تو اس کی آواز کانپتی ہے اور دوسرے اس کا ہاتھ بھی ساتھ ساتھ ہلتا رہتا ہے۔ اگرچہ اس مشاعرے میں اس نے عقل مندی سے کام لیتے ہوئے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا تھا مگر وہ پیچھے بھی ہل رہا تھا۔ قتیل کو ترنم سے بالکل نہیں پڑھنا چاہیے۔ باذوق لوگ آج بھی اس کے شعر سنتے ہیں اور انہیں سراہتے ہیں اور بے ذوق صرف ترنم!

احمد راہی نے ایک غزل پڑھی۔ اس کا معاملہ بھی عجیب الٹ پلٹ ہے ترنم تو بڑے دور کی

بات ہے اس کا تحت اللفظ بھی خراب اور بے سرا ہے۔ جانے سے پہلے اس نے مجھ سے پوچھا کہ کونسی غزل پڑھوں۔ میں نے جس غزل کا نام لیا میرا خیال تھا وہ خوب ہوٹ ہو گا۔ مگر مجھے ناامیدی ہوئی اور سامعین نے اسے غزل پر داد دی۔ اس کے بعد اس نے پنجابی نظم نواں نواں بور سنائی جسے لوگوں نے بے توجہی سے سنا اور بے حد داد دی۔

مسٹر عرفانی سامنے کرسی پر بیٹھے تھے اور ہر نئے شاعر کی آمد پر وہ سوڈے کی بوتل پھک سے کھولتے اور غٹاغٹ پینا شروع کر دیتے اب تک وہ آٹھ بوتلیں پی چکے تھے۔ وہ شاعر کا ہر مصرع بلند آواز میں دہراتے تھے۔ ہر مصرع ان سے ٹکرا کر ایک بار پھر بلند ہوتا تھا۔ قمر اجنالوی آیا تو سٹیج کے سامنے عرفانی صاحب جھکے جھکے بڑی احتیاط سے اٹھ کر کبھی اس طرف جا کر کھسر پھسر کرتے اور کبھی اس طرف جا کر زور سے چھینک مارتے اور واہ۔ واہ۔ واہ۔ واہ کرتے واپس کرسی پر آ کر بیٹھ جاتے۔ قمر نے حسب معمول غیر موثر لہجے اور کمزور سی آواز میں ایک نظم پڑھی اور میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ربیعہ فخری تشریف فرما تھیں۔ ان کا ترنم کچھ اس قدر الجھا ہوا تھا کہ لوگ بے چین ہو گئے اور انہیں پوری طرح سن نہ سکے۔

ظہیر کاشمیری سٹیج پر آیا تو اگلے صوفوں کی قطار پر ایک خاتون ساڑھی پہنے ایک کوٹ والے کا سہارا لیے سو رہی تھی۔

ظہیر نے ڈکشنری میں سے کئی ایک پتھر اٹھا کر اس طرف پھینکے مگر کوئی بیدار نہ ہوا۔ اور ظہیر بے چارا اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ عرفانی صاحب نے پھک سے سوڈے کی بوتل کھولی اور زہرہ نگاہ سٹیج پر تشریف لائیں۔ وہ حسب عادت کنی سمٹائیں نظریں جھکائے لیکن چاروں طرف دیکھتے ہوئے مائیک کے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں اور غزل گانی شروع کر دی۔ ان کا ترنم بڑا باریک ہے۔ جب وہ پڑھتی ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے سوئی کے ناکے میں ریشمی دھاگہ گذر رہا ہو۔ وہ پڑھ رہی تھیں اور عرفانی صاحب دم بخود اور لیمن بکف بیٹھے سن رہے تھے۔

میرے پیچھے بیٹھے ہوئے احمد ظفر نے کہا

''شعلہ سالپک جائے ہے آواز تو دیکھو''

میں نے کہا۔

''یہ شعلہ نہیں ہے۔''

''شعلی سی لپک جائے ہے آواز تو دیکھو۔''

اس لیے کہ زہرہ نگاہ کی آواز واقعی باریک ہے اور پنجاب میں زیادہ پڑھنے سے اور باریک ہوگئی ہے۔اور اگر وہ اسی طرح پڑھتی رہیں تو بہت ممکن ہے وہ سنائی ہی نہ دے۔

ان کے بعد عرفانی صاحب نے بوتل کھولی تو حفیظ جالندھری صوفے سے اٹھے اور گردن جھکائے سٹیج پر تشریف لائے۔کتابیں میز پر رکھ کر انہوں نے چشمہ صاف کیا اور دیباچے کے طور پر باتیں شروع کر دیں۔باتیں سن کر محسوس ہونے لگا جیسے انہوں نے دیباچہ کسی اور سے لکھوایا ہے۔انہوں نے مس ربیعہ فخری کی تعریف میں کہا۔

اگر محترمہ کو واقعی کوئی تکلیف ہے۔تو انہیں شعر ترنم سے نہیں پڑھنا چاہیے۔اور یہ بات ہے بھی درست۔ربیعہ صاحبہ بے چاری شاعرہ ہیں۔انہیں سر تال سے کیا لینا۔دونت کر کے ہاتھ گھما کر اور گلے میں مرکیاں ڈال کر نہیں گا سکتی ہیں۔لہذا انہیں بالکل نہیں گانا چاہیئے۔

حفیظ صاحب نے حاضرین کے اصرار پر رقاصہ سنائی۔اس کے بعد انہوں نے غزل سنائی جو واقعی خوب صورت غزل تھی۔پھر انہوں نے حسب معمول غیر ضروری طور پر نوجوان لکھنے والوں پر گھٹیا انداز میں طنز کرنا شروع کر دیا اور مجھے آسکر وائیلڈ کا وہ جملہ یاد آ گیا کہ۔

''زندگی اپنا آخری راز نوجوانوں کے کان میں کہتی ہے اور بوڑھوں کو نوجوانوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔''

مجھے حفیظ صاحب کی ذہنی حالت پر ہنسی آ گئی اور کچھ کچھ ترس بھی آیا۔بعض لوگ انہیں فردوسی اسلام کہتے ہیں لیکن میرے خیال میں یہ فردوسی کی بھی توہین ہے اور اسلام کی بھی۔فردوسی

روپے کی محبت میں مخلص تھا۔اور حفیظ اسلام کی محبت میں غیر مخلص۔یہ وہ فردوسی ہیں جنہوں نے اسلام کی تبلیغ کی اور کفر میں جا کر پناہ لی۔یہ پہلے فردوسی سے دو قدم آگے ہیں۔پہلے فردوسی کا غیر مخلص شاہنامہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور دوسرے فردوسی کا مخلص ''اسلام نامہ پھک سے اڑ جائے گا۔جس طرح خیر فانی صاحب سوڈے کی بوتل کا کاک اڑاتے ہیں۔''

پھک' ایک اور کاک اڑا اور صاحب صدر نے مشاعرہ ختم کر دیا۔

مشاعرے کے بعد باقی شاعر پونچھ ہاؤس چلے گئے اور راہی، میں اور طارق ہم پونچھ ہاؤس کے ساتھ ہی نصیر انور کے کمرے میں آ گئے۔نصیر ہمیں ساری رات ''آوازار'' یعنی تنگ کرنا چاہتا تھا۔اور وہ زبردستی ہمیں اپنے ساتھ لے گیا طارق بستر پر گرتے ہی سو گیا اور ہم تینوں سگریٹ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔مستی گیٹ سے ہوتے ہوئے نصیر ہمیں سنٹرل ہوٹل لے گیا۔اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا اور ہوٹل کے اندر باہر اندھیرا تھا۔نصیر بولا۔

یہاں ایک دوست رہتا ہے بس ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

چوکیدار سے دروازہ کھلوا کر ہم اوپر گئے ایک کمرے کے باہر ہم رک گئے دروازہ اندر سے بند تھا۔نصیر چوروں کی طرح جھک کر کھڑکی کے اندر کود گیا اندر پہنچ کر اس نے دروازہ کھولا۔بتی جلائی اور میں نے دیکھا ایک لڑکا گھٹنے سینے سے لگائے سوالیہ نشان بنا پلنگ پر سو رہا ہے۔میز پر باسی روٹیاں اور سالن پڑا تھا۔نصیر نے اسے جگایا اس کے کوٹ کی جیب میں سے ساڑھے اٹھارہ آنے نکالے اور بتی بجھا کر باہر آ گیا۔

وہ بولا:۔

''یہاں جب آؤ پیسے مل جاتے ہیں۔''

میں نے کہا:۔

''اور اسی چلو پنڈی آن رہیں لاہور میں تو جب جاؤ پیسے ختم ہو جاتے ہیں۔''

اس کے بعد ہم نے سٹیشن پر جا کر گولڈ فلیک کے سگرٹ خریدے۔ اور قہوہ خانہ کے باہر بنچ پر بیٹھ کر چائے پی پشاوری تمباکو یعنی کلیان پیا نصیر انور کھانسنے لگا اور بولا۔

"یہ بڑا اکڑوا تمباکو ہے"

میں نے اس کی پشت پر ہاتھ مار کر کہا"

"واہ دارا غلے کنال پختونے"

راہی نے پوچھا۔

"اس کا مطلب؟"

میں نے کہا:۔

"یہ پشتو میں میرا جی کی نظم کا مصرع ہے۔

واپس کمرے میں آئے تو طارق سگریٹ کی خوشبو سونگھ کر اٹھ بیٹھا

"سگریٹ پلاؤ بھئی"

رات تین بجے تک ہم نے کمرے میں خوب دھما چوکڑی مچائی۔

میز پر موم بتیاں روشن تھیں۔ یہ موم بتیاں "ہینڈ لوم" تھیں اور نصیر انور نے خود بنائی تھیں۔

نصیر نے میز کا طبلہ بجاتے ہوئے ہمیں کشمیری لوک گیت اور کلاسیکل گانے اور پہاڑی راگ سنائے۔ پھر میں بھی اس کے ساتھ گانے لگا اور بالٹی کا طبلہ اور پیالیوں کا جلترنگ بجایا اور طارق سو گیا اور زمین پر گدیلا بچھا کر راہی اور نصیر انور سو گئے اور میں چار پائی پر لیٹ گیا۔

بمشکل آدھ گھنٹہ گذرا ہوگا: کہ آنکھ کھل گئی۔ راہی میرے بستر میں گھس رہا تھا۔

"اوئے ماما ادھر کدھر"

"یار ٹھنڈ لگ دی اے"

راہی کو سردی لگتی تھی وہ میرے ساتھ سو گیا۔ میں بھی سونے کی کوشش کرنے لگا۔ نیند آ رہی تھی کہ طارق اچانک کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلا اور صبح کی ہوا میں بازو پھیلا کر بولا۔

"اوئے دن چڑھ گیا جے اوئے"

اس کے بعد نصیر انور بھی اٹھ بیٹھا اور اس نے ہمیں بھی چار پائی سے گھسیٹ کر نیچے پھینک دیا۔ میں اور نصیر انور دوسرے شاعروں کو تنگ کرنے کے لیے یوتھ ہاؤس میں داخل ہوئے۔ میں نے قتیل شفائی کا کمبل کھینچ لیا۔ نصیر نے فارغ کی چار پائی الٹ دی۔ قمر پر پانی کی بالٹی الٹ دی گئی۔ نصیر، ضمیر کاشمیری کی چار پائی کے نیچے گھس گیا اور تھوڑی دیر بعد کاشمیری ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

"DONT DO THIS IS SAY"

میں نے کہا:۔

"انور وودس اگین پلیز"

ساتھ ہی قاسمی صاحب سوئے ہوئے تھے۔

انہیں تنگ کرنے کا حوصلہ ہمیں نہ ہوا۔ صرف بڑی محبت سے انہیں ہلا ہلا کر اٹھا دیا گیا۔ قتیل ختیں کرنے لگا۔

"خدا کے واسطے ذرا اور سو لینے دو"

ضمیر بولا۔

"مجھے اپنی صحت تم سب سے زیادہ عزیز ہے"

میں نے کہا:۔

"تمہاری صحت ہی نہیں ہے۔ عزیز کون ہے سالا؟"

اس کے سرہانے چائنز دارفیئر ان ملایا پڑی تھی۔ اس کے بعد وہ بڑے سیرئس انداز میں ہم دونوں کو زندگی گذارنے کے لیے صحیح اپنی چیوڈ سے روشناس کراتے ہوئے بور کرنے لگا۔

نصیر نے کہا۔

"ضمیر چلو چائے پلاؤ"

ظہیر اپنے سنہری بالوں کی دگ درست کرتے ہوئے بولا۔

"میرے پاس دس کا نوٹ ہے۔

تو نے پیسے نہیں ہیں۔"

مستی گیٹ کے اندر ایک بڑی مشہور دوکان پر جا کر میں' راہی' طارق اور نصیر نے انتہائی واہیات لسی پی۔ رجعت پسند حلوہ کھایا۔ اور پنڈی بنانے والوں کو گالیاں دیتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔

پورے بارہ بجے شاعروں کا سنہری ٹور بس میں سوار ہو کر مری روانہ ہو گیا۔

سارا پہاڑی سفر تھا۔ بڑی دلچسپی سے گذرا۔

چھرہ پانی پہنچ کر ہم نے ڈرائیور کو درمیان میں کھڑا کر کے تصویریں لیں۔

سنترے چرائے۔

کھانا کھایا

اور مری پہنچ گئے۔

مری میں بارش ہو رہی تھی۔

اور سردی بڑھ گئی تھی۔ سب شاعروں کو ٹھنڈ لگنے لگی۔

راہی' قمر' ظہیر اور نصیر انور کے لیے گرم کوٹ مہیا کئے گئے۔ ایمبسڈر ہال میں مشاعرے کا انتظام کیا گیا تھا۔

چار بجے مشاعرہ شروع ہوا۔ اور چھ بجے ختم ہو گیا۔

باہر خوب بارش ہو رہی تھی۔

حیدری صاحب کے مکان پر پہنچتے ہی قمر اجنالوی کو دل کا دورہ پڑ گیا قتیل بھی ایک دم بیمار ہو گیا تھا۔

قاسمی صاحب ان دونوں کو دیکھ کر نیم بیمار ہو گئے۔

رات اسی طرح کٹ گئی۔

صبح بارش تھم گئی تھی لیکن بادل بدستور چھا رہے تھے۔

اور سرد ہوا چل رہی تھی۔

دوپہر سے پہلے پہلے سبھی شاعر بس میں سوار ہو کر پنڈی پہنچ گئے۔

دوسرے دن اپوا کی جانب سے عورتوں نے ایک خاص بزم مشاعرہ منعقد کی۔

یہ بزم کمپنی باغ کے پردہ کلب میں سجائی گئی۔

اس بزم خواتین میں پانچ عورتیں اور پچپن مرد تھے۔

ظہیر کاشمیری اس محفل کے لیے خاص طور سے زری کی چپل خرید کر لایا تھا۔ جس کے تلے پر بھی تلا لگا ہوا تھا۔

وہ جوتا سر پر پہننے کے لئے تھا۔ ظہیر اسے پاؤں میں ڈال کر چوڑی دار پتلون اور چوڑی دار شیروانی میں ملبوس بگلا بنا سٹیج پر آیا اور شعر سنا کر واپس آ گیا۔

مشہور شاعرہ صاحبہ نے سلیم شاہی جوتی پہن رکھی تھی۔

جس کی ایڑیاں خدا جانے کیوں بٹھا دی گئی تھیں۔

یعنی وہ ٹھسی کر کے چل رہی تھیں۔

منہ میں گلوری'

پاؤں میں سلیم شاہی ٹھسی جوتی اور پھر انہوں نے ترنم کی بجائے تحت اللفظ سنایا۔

جو عجیب و غریب تھا۔

اور یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے شعر ٹھسے ہو گئے ہوں۔

جیسے شعروں کی ایڑیاں بیٹھ گئی ہوں۔ جوتے کے اس مقابلے میں انہوں نے سلیم شاہی کا ستیا

ناس کر کے ظہیر کی زری چپل کو شکست فاش دی۔ ظہیر بڑا خوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی زری چپل نے لوگوں کو مسحور کر دیا ہے۔ جب وہ کرسی پر بیٹھا تو ظفر نے کہا۔۔۔ ظہیر صاحب سگرٹ منگوائیے۔

ظہیر بولا۔

میرے پاس دس کا نوٹ ہے نوٹا ہوا۔۔۔۔۔۔

اور وہ دس کا نوٹ آج بھی اس کے پاس ہے اور ہر سفر میں موجود رہے گا۔

ہوٹلوں کا لاہور

لاہور ہوٹلوں کا شہر ہے۔

لاہور کی نفسیات ہوٹلوں میں چھپی ہوئی ہے۔ اس شہر کا ہر ہوٹل اپنی جگہ پر ایک انسٹی ٹیوشن ہے۔ ایک مکمل سکول آف تھاٹ ہے۔ ان ہوٹلوں میں ٹی ہاؤس ہے۔ کافی ہاؤس ہے۔ میٹرو ہے۔ میکلوڈ کے ہوٹل ہیں۔ سرکلر روڈ، لوہاری گیٹ، بھاٹی گیٹ، اور چوک گوالمنڈی کے ہوٹل ہیں مال میکلوڈ کے ہوٹلوں میں بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں۔ جو نئی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ اور اندرون شہر کے قہوہ خانوں میں بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جو دم توڑتی تہذیب و تمدن کو سہارا دیئے ہوئے ہیں آیئے ان پرانے قہوہ خانوں کی سیر کی جائے۔

ایک پرانے بازار کے بوسیدہ سے ہوٹل میں کچھ دوست میزوں کے گرد کرسیوں پر نیم دراز سگریٹ اور چائے سے لطف اٹھا رہے ہیں اور مصر کی تازہ ترین صورت حالات پر گفتگو کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کا سیاسیات پر بات چیت کرنے کا انداز بھی اپنا ہے۔ نقاد کے خیال میں مصر میں نیا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ شاعر بولا۔

''میں حیران ہوں ایران کیوں خاموش ہے؟''

"وہ تیل دیکھ رہا ہے اور تیل کی دھار دیکھ رہا ہے"

مگر ان تلوں میں تیل نہیں ہے۔

تلوں میں تیل نہ سہی مگر ان کی ملوں میں تیل ضرور ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے خیال سے بہت جلد متفق ہو گئے اور انہوں نے اصرار کیا۔

کہ دیوتاؤں' کاہنوں اور فرعونوں کے مصر کا ذکر چھیڑا جائے۔

چنانچہ ایک شاعر سیف الدین کے منظوم کھیل' ساربان' میں سے وہ ٹکڑا پڑھ کر سنایا۔ جب ساربان اپنی محبوبہ گلنار کو بتاتا ہے کہ وہ رات کو صحرائی سفر چھتے' کھیلتے' گاتے ہوئے طے کرتے ہیں اور جب کبھی خاموش ہو جاتے ہیں تو۔

اس خموشی میں ناگہاں کوئی — چھیڑ دیتا ہے داستاں کوئی
ذکر پریوں کی داستانوں کا — ساحروں کے طلسم خانوں کا
مصر و یونان کے پری خانے — بابل و نینوا کے افسانے
اور خیالوں میں خواب بنتے ہوئے — حسن و الفت کے راگ سنتے ہوئے
چھاگلوں کی طرب نوازی میں — شعر گوئی میں نغمہ سازی میں
راستہ خواب ہوتا جاتا ہے — عزم رفتار مسکراتا ہے
کس قدر مختصر ہیں یہ راہیں — جیسے گرد سفر ہیں یہ راہیں

ان اشعار نے ایک سماں باندھ دیا۔ دوسرے شاعر نے یہ سماں کھول کر اپنا سماں باندھنا چاہا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ اپنے لبوں پر زبان پھیر کر دوسرا شاعر بولا۔

تمہاری چاہ کہاں ہے۔ ڈبے کی سپیشل زعفرانی چاۓ"۔

نقاد بولا:۔

"صبر کرو۔ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے"۔

نانبائی چیخ اٹھا۔

"صبر کے میٹھے پھل کا انتظار کرنے والو! صبر کے درخت پر کوئی پھل نہیں آتا۔"

موچی دروازے کے باہر ایک جلسہ ختم ہوا تھا کچھ لوگ جلسہ سن کر واپس آ رہے تھے۔

ایک نیم پہلوان سے حضرت صافہ گلے میں لپیٹے ہاتھ ہلا کر کہہ رہے تھے اگر وزیر بن جاؤں تو ساری دنیا فتح کر لوں۔ تلوار پکڑ کر بس کچا کچ صفایا کرتا جاؤں"

اس کا ساتھی بولا۔"

"بیٹھ اوئے بغدادی چور دیا پترا!"۔

اس قہوہ خانے سے ذرا دور۔۔۔ دوسری سڑک کے سامنے ایک اور ہوٹل ہے جس کا نام بسم اللہ ہوٹل ہے۔ ہم اس ہوٹل میں گجرات کی بنی ہوئی پھول دار پیالیوں میں گرم گرم شربت نما چائے پی رہے تھے ہمارے پاس ہی ایک اور گاہک سالن کی پلیٹ ہاتھ میں پکڑ کر اٹھا اور ہوٹل کے منیجر کے پاس جا کر جھک کر بولا۔

"بسم اللہ کا ثواب ہو۔ ذرا یہ بتایئے آپ کے گاہک سالن کہاں پھینکا کرتے ہیں؟"

وہ گاہک چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد ایک اور گاہک چنگیر میں رکھی ہوئی روٹی کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"حضور غلطی سے اس پلیٹ میں روٹی کے بجائے توا آ گیا ہے۔

دراصل روٹی بہت جلی ہوئی تھی۔ ہوٹل کا مالک بولا۔

"بھائی صیب اناج ہے اناج۔ اس کی بے ادبی نہ کریں۔"

بھائی صیب افسوس بھرے لہجے میں بولے۔

"تو پھر اسی اناج نے حضرت آدم کو جنت سے نکلوایا ہو گا"

اسی ہوٹل میں ہمارے ایک دوست شام کو اکثر بیٹھا کرتے ہیں۔ ویسے تو آپ مسلمان ہیں اور خدا اور رسولؐ پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن پیروں فقیروں کے سخت خلاف ہیں اور تعویذ گنڈے کے سخت خلاف ہیں اور تعویذ گنڈے پر ان کا بالکل اعتقاد نہیں ہے۔ کچھ روز ہوئے آپ

کی بچی سخت بیمار ہوگئی۔ ڈاکٹروں اور حکیموں کا علاج کروایا گیا مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔

کسی نے کہا کہ بوہڑ والے پیر کے پاس جاؤ۔ آپ نے صاف انکار کر دیا لیکن عورتیں ذرا ضعیف الاعتقاد ہوتی ہیں۔ چنانچہ ان کی بیوی نے جھگڑ کر انہیں ساتھ لے چلنے پر آمادہ کر لیا۔ پیر جی کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ وہ ہر مسلمان کی خاطر تواضع موٹی موٹی گالیوں سے کرتے تھے۔ آپ بڑے گھبرائے مگر بے بس تھے۔ لاچار چپکے ہو رہے۔ پیر جی نے بچی کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اس کے باپ کو کھانے کے لیے دو نارنگیاں دیں۔ آپ نے نارنگیاں جیب میں رکھیں اور پیر جی کے چیلوں کو پانچ روپے دے کر واپس تانگے میں آ کر بیٹھ گئے۔ راستے میں نہ جانے آپ کے دل میں کیا آئی کہ دونوں نارنگیاں تانگے والے کو دے دیں۔ اب کرنا خدا کا کیا ہوا کہ دوسرے دن وہی کوچوان پھلوں کی چھوٹی سی ٹوکری لیے آپ کے گھر آن حاضر ہوا۔ جب اس تقریب کی وجہ پوچھی گئی۔ تو کوچوان نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔

''حضور آپ نے دو نارنگیاں دی تھیں۔''

''ہاں ہاں۔۔۔۔۔پھر؟''

''تو حضور میں نے دو کا بائیس بنا کر دو روپے کا ڈبل لگا دیا۔ وہ آ گیا اور مجھے ایک سو اٹھائیس روپے مل گئے۔ آپ کے بال بچوں کو دعا دینے آیا ہوں۔ پھر کب نارنگیاں لینے آؤں؟''

اب وہ کوچوان ہفتے میں ایک بار ان کے گھر درشن کرنے ضرور نکل آتا ہے۔ اور اپنے منہ سے نارنگیاں نہیں مانگتا بلکہ چپکا ہو کر بیٹھا رہتا ہے اور اس وقت کا انتظار کرتا ہے کہ جب حضور کے من میں لہر آئے اور وہ اسے ایک آدھ نارنگی عطا کر دیں۔

ایک اور ہمارے کرم فرما ہیں جنھوں نے چھ مرتبہ منشی فاضل کا امتحان ''پاس'' کیا ہے اور آج کل تاریخ اسلام پر تحقیق کر رہے ہیں۔ پرسوں اسی ہوٹل میں اس موضوع پر بحث ہو رہی تھی کہ اسلام میں لونڈیوں کا وجود جائز ہے یا نہیں مسئلہ طول پکڑ گیا اور فریقین کسی ایک فیصلے پر نہ پہنچ سکے۔ اتنے میں ہمارے یہی دوست تشریف لے آئے جب آپ سے استفسار کیا گیا تو

آپ نے بڑے عالمانہ انداز میں فرمایا۔

''ہارون رشید کے دور میں لونڈیاں جائز تھیں لیکن بعد میں جب اسلام کا ظہور ہوا تو انہیں حرام قرار دے دیا گیا۔

انہی صاحب نے اپنے گھر کے دیوان خانے میں بڑی خوب صورت امریکی ایکٹریسوں کی تصویریں لگا رکھی ہیں۔ کارنس کے اوپر چوکھٹے میں بڑے جلی حروف میں یہ مقولہ لکھوا کر لگا رکھا ہے۔

''خدا ان کی حفاظت کرتا ہے جو میرا وقت ضائع نہیں کرتے''

حالانکہ ہم نے ان لوگوں کو بھی خدا کے تحفظ میں دیکھا ہے جو نہ صرف وقت بلکہ بچے تک ضائع کر دیتے ہیں۔

اب ذرا میکلوڈ روڈ کے ہوٹلوں کی طرف آئیے۔

یہ ہوٹل پرانے اور نئے شہر کے درمیان چھوٹے چھوٹے غیر قانونی جزیروں کی طرح آباد ہیں۔ یہ ہر ٹائپ کے لوگ آ کر بیٹھتے ہیں۔ یہ پرانے اور نئے لاہور کے درمیان فری پورٹ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں ہمارے ایک حاجی صاحب ہیں جو امرتسر میں تین بار نبوت کا دعوے کر کے تینوں بار ناکام ہو چکے ہیں۔ کل رات میں اس ہوٹل میں گیا تو ریڈیو پر لتا گا رہی تھی۔

بلما جا جا جا

اور باورچی انگیٹھیوں پر جھکا سالن کی بوٹیوں کا معائنہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''آج گوشت کیوں نہیں گل رہا؟''

خان علی بابا نے اسی طرح میز پر ٹانگیں پھیلا رکھی تھیں اور اپنے ساتھی کو اس وقت کسی گھوڑے پر روپیہ لگانے سے پہلے پڑھی جانے والی عربی دعا سنا رہا تھا۔

حاجی صاحب حسب معمول گرم چادر اوڑھے کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھے علم دین پٹواری

کے کان میں کہہ رہے تھے:۔

''صبح بکرے کی سات 'سریاں' پکائی تھیں جن میں سے تین کا دماغ خراب تھا۔''

پٹواری کہنے لگا:۔

''پھر تو بڑا برا ہوا حاجی''

حاجی ایک آدمی کو گھورتے ہوئے بولا:۔

''میں بھی تو اسی لئے گاہکوں کو نشٹ کر رہا ہوں جو میرا سالن کھا کر گئے ہیں ایک تو وہ سامنے بیٹھا ہے۔''

اور جو سامنے بیٹھا تھا وہ اپنے سگرٹ میں سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کو ہاتھ سے پکڑنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

ہم لوگ یہی باتیں کر رہے تھے کہ ایک بزرگ صورت آدمی اندر تشریف لائے اور علم الدین پٹواری سے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد گویا ہوئے۔

''یار علمو! ہم تو بھئی اپنے ہمسائے سے تنگ آ گئے ہیں۔''

حاجی صاحب بولے:۔

''کیا کہتا ہے وہ رشتہ مانگتا ہے؟''

اس پر اس بزرگ صورت آدمی نے حاجی کو ایک موٹی سی گالی دی جس کا جواب حاجی صاحب نے بیڑی کا گل جھاڑ کر دیا۔ بزرگ بولے:۔

''بات یہ ہے کہ میں ٹھہرا نمازی پرہیزگار اور وہ سالا خدا کو ہر وقت گالیاں دیتا رہتا ہے وہ تو پکا دہریہ ہے۔''

علمو بولا:۔

''چلو یار کیا خبر تمہارے وسیلے سے وہ گنہگار بھی جنت میں چلا جائے۔''

حاجی صاحب فوراً بولے:۔

''اور کیا خبر اس گنہگار کے وسیلے سے یہ بھی دوزخ میں چلے جائیں۔''

اس ہوٹل کی بالکونی میں اکثر آرٹسٹ اور فلمی شاعر آ کر بیٹھا کرتے ہیں۔ آرٹسٹوں میں ہر قسم کے آرٹسٹ ہوتے ہیں۔ خیال پرست' اسلوب پرست' خیال' اسلوب پسند' حقیقت پسند' خیال پسند' ترقی پسند' غرض یہ کہ ہر مدرسہ کا طالب علم اپنے نظریات کی حمایت میں مولیر اور رسکن کی کتابوں سے دلائل کھینچ کر لاتا ہے چائے اور سگرٹ کی گرمی میں محفل کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر آپ ان کی منڈلی میں آدھ گھنٹہ بیٹھ جائیں تو باہر نکل کر آپ جو پہلا منظر دیکھیں گے وہ یا تو خیالی معلوم ہو گا یا تکونوں اور زاویوں کی صورت میں دکھائی دے گا۔ اور اگر آپ عقل مند ہیں تو ٹھنڈے پانی کے دو گلاس پی کر گھر کی راہ لیں اور اگر خدانخواستہ زیادہ عقل مند ہیں تو اس منظر کو پینٹ کرانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیں گے ایک دن ایک نوجوان طالب علم کچھ اسی قسم کا تاثر لے کر گھر گیا اور اس نے جاتے ہی اپنے کمرے کی ساری کھڑکیاں اور دروازے پینٹ کرنے شروع کر دیئے۔

تصویروں سے یاد آیا پیرس میں جب ادب اور آرٹ کا کلاسیکی دور تھا۔ مشہور مصور گوگاں نے اپنی ایک تصویر ایک دوکاندار کے پاس فروخت کرنے کے لیے رکھ دی۔ ایک تصویر میں دو ناریل پڑے تھے جن میں ایک ناریل کا رنگ گہرا سرخ تھا۔ اتفاق سے ایک روز مصور خود بھی اس دوکان پر موجود تھا کہ ایک یہودی گاہک نے وہ تصویر پسند کی اور دکاندار سے اس کی قیمت پوچھی۔ دوکاندار نے کہا:۔

''سو فرانک''

یہودی کچھ دیر تصویر کو غور سے دیکھتا رہا پھر بولا:۔

''اور اگر صرف ایک ناریل خریدنا چاہوں تو؟''

راوی بیان کرتا ہے کہ گوگاں اسی روز بارسلز روانہ ہو گیا اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔

اسی سڑک کے ایک منفرد شاعر میکلوڈ روڈ کے اس جنت مقام ہوٹل میں روزانہ آیا کرتے

تھے۔آپ یہاں بیٹھ کر شعر تیار کرتے تھے۔اسے لوگوں کے کانوں میں زبردستی انڈیلتے تھے اور پھر ادھار چائے وغیرہ پی کر چلے جاتے تھے۔جب ادھار کی رقم زیادہ ہوگئی اور ہوٹل کے منیجر کے بار بار تقاضا کرنے کے باوجود منفرد شاعر کے کانوں پر بیٹھی ہوئی جوں تک نہ رینگی تو منیجر نے بڑا ترقی پسندانہ طریقہ اختیار کیا۔آپ نے وضو کر کے مولانا روم کی مثنوی کھولی تو یہ مصرع سامنے آگیا۔

بزرجاج دوست سنگ دوست زن

چنانچہ آپ نے رومی کے نظریئے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے منفرد ڈھب سے منفرد سلوک اختیار کیا۔انہوں نے کاونٹر کے شیشے کے نیچے یہ لکھ کر رکھ دیا۔

''حضرت اورک گلادھوی کی طرف ہوٹل ہذا کے پینتیس روپے دس آنے دو سال سے واجب الادا ہیں۔''

نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے دوست نے اسی روز رقم ادا کر دی اور ہوٹل بھی چھوڑ دیا۔آج کل وہ کسی ایسے ہوٹل کی تلاش میں ہیں جس کا منیجر مولانا رومی کو نہ پڑھ سکتا ہو۔

اب ذرا مال کے ٹی ہاؤس کی جانب آیئے۔

اس ہوٹل میں بڑا بڑا شاعر لوگ آ کر بیٹھتا ہے۔ذرا دیکھئے رات بھیگ چلی ہے اور چاندنی میں مال چمکنے لگی ہے اور عمارتوں کے عقب میں دسمبر کا دھندلکا پھیل گیا ہے اور اس ٹی ہاؤس میں تین شاعر اور ایک کشمیری ہاتو نما آدمی بیٹھے ہیں اور فلک کج رفتار کی ستم رانیوں پر باتیں ہو رہی ہیں۔سردیاں آگئی ہیں اور گرم کپڑے نہیں ہیں۔رات گذر رہی ہے اور پیسے ختم ہو گئے ہیں۔اب وہ شعر و شاعری کی طرف سمٹ آئے ہیں۔ملتان کا شاعر خچر کی طرح ہنہنا کر کہتا ہے:۔

''دوستو! میں بہت بڑا شاعر ہوں۔میں اگر چاہوں تو اخبار میں قلم اٹھا کر (تمہارے خلاف) تمہیں تباہ کر سکتا ہوں۔میں تم لوگوں کو پھونک مار کر اڑا سکتا ہوں۔''

ہاتو نما شریف آدمی امیر حمزہ ٹائپ کی ٹوپی پہنے ہاتھ جوڑ کر بولا:۔

''حضور! آپ پھونک نہ بھی ماریں جب بھی میں اڑ جاؤں گا۔''

اب امرت سری شاعر ایک غزل سنا رہا ہے۔اس غزل میں سوائے تغزل کے اور سب کچھ ہے۔اب ملتانی خچر کی باری ہے۔وہ زور سے خرخراتا ہے اور دولتی جھاڑ کر ایک غزل سناتا ہے جو ایک انگریزی غزل کا ترجمہ ہے۔اب امیر حمزہ کی باری ہے' وہ اپنی عربی ٹوپی پر ہاتھ پھیر کر زور سے چھینک مارتا ہے اور اپنے ساتھی سے التجا کرتا ہے۔

''اگر اجازت ہو تو اپنا سگرٹ آپ کے سر میں بجھالوں؟''

اس کے بعد وہ کہتا ہے:۔

''زندگی میں صرف ایک ہی شعر لکھا ہے وہی سنائے دیتا ہوں''

''ضرور' ضرور''

''عرض کیا ہے

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے جناب غالب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

دونوں خچر اسے پیٹنے کے لئے اٹھے لیکن امیر حمزہ باہر نکل گیا۔سڑک پر جا کر اس نے اپنی ٹوپی اتار لی اور غائب ہو گیا۔

پرسوں اس ٹی ہاؤس میں ایک دلچسپ واقعہ دیکھنے میں آیا۔شام کا وقت تھا۔لوگ اپنی میزوں پر بیٹھے خوش گپیوں اور چائے نوشی میں مصروف تھے کہ ایک صاحب جن کی داڑھی لمبی سر پر کلاہ' آنکھوں کے گرد حلقے' ماتھے پر محراب اور شلوار ٹخنوں سے اونچی اندر تشریف لائے اور کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر انگلی اٹھائی اور بولنا شروع کر دیا۔

''اے مسلمانو! اے غفلت کی چارپائی پر غفلت کی چادر اوڑھ کر سونے والے غافلو! کوئی عقل کرو کیوں تم نے اپنی ست گنوا دی ہے۔دنیا چند روزہ ہے اس لئے روزے رکھو نماز

قائم کرو' کچھ نہ کچھ ضرور قائم کرو۔ قیامت کے دن خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے؟''

ایک آواز:۔ ہم خدا کو منہ نہیں دکھائیں گے''

''اے چائے کی گرم گرم پیالیاں پینے والو! ہوش کی دوا کرو۔ موت کا بھوت تمہارے پاس کھڑا ہے وہ تمہیں کسی وقت بھی ہڑپ کر سکتا ہے۔''

دوسری آواز:۔ ہاں وہ تو پاس ہی کھڑا ہے۔

''میں خدا کی جانب سے تمہیں نیکی کا راستہ دکھانے آیا ہوں۔ میرے بھائیو بتاؤ! نیکی کا راستہ کہاں ہے؟''

وہی آواز:۔ یہاں سے نکل کر دائیں ہاتھ مڑ جائیے۔ ایک سڑک ملے گی۔ وہاں سے پھر گھوم جائیے۔ پھر ایک سڑک ملے گی وہاں سے پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ٹی ہاؤس میں نعرہ تکبیر کا شور بلند ہوا اور مولوی صاحب فوراً وہاں سے بھاگ گئے پہلی اپریل بیوقوفوں کا دن سمجھا جاتا ہے۔ قدیم زمانے سے اس دن کو بیوقوفوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس روز دنیا کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں ہوشیار لوگ احمقوں کو۔ اور احمق لوگ ہوشیار لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔ ٹی ہاؤس کے سامنے اپریل کی پہلی کو کچھ نوجوان سڑک پر پانچ کا نوٹ پھینک کر الگ جا کر کھڑے ہو گئے۔ ایک بڑے وضعدار قسم کے معمر بزرگ نوٹ کو بے یار و مددگار دیکھ کر وہاں خود بخود رک گئے کچھ پس و پیش کیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ پھر گھٹنا کھجلاتے ہوئے ذرا جھکے اور نوٹ پکڑنے ہی کو تھے کہ لڑکوں نے شور مچا دیا۔ اور وہ صاحب ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھے بغیر ہی دوسری طرف کو نکل گئے۔

ٹی ہاؤس کے منیجر کو یکم اپریل کا بری طرح احساس تھا۔ وہ صبح ہی سے لوگوں کو بیوقوف بنا رہے تھے۔ آخر وہ بچ کر کہاں جاتے ایک صاحب انہیں بھی فول بنا گئے۔ یہ ایک زندہ دل گاہک تھے۔ آپ نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور بل ادا کئے بغیر ہی وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔ منیجر نے لاچار ہو کر ان کے بل پر خود ہی ''اپریل فول'' لکھا اور تار میں پرو دیا۔

وہ دیکھئے ایک صاحب اپنے مہمان کو کرکٹ کا حال سنا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ:۔

''اس کے بعد اس نے گیند پھینکی اور اس کے ساتھ ہی تینوں وکٹیں اڑ گئیں۔''

اس کے بعد انہوں نے بڑے اطمینان سے ہاتھ پلیٹ کی طرف بڑھایا ہے اور یکے بعد دیگرے تین کریم رولز اڑا دیتے ہیں۔

پرسوں دوپہر کو ایک صاحب ٹی ہاؤس میں تشریف لائے اور منیجر سے پوچھنے لگے:۔

''دو سیر شکر قندی چاہیے''

''کیا جناب؟'' منیجر نے حیرانی سے پوچھا

''شکر قندی''! آپ نے بڑے اطمینان سے کہا

منیجر بھونچکا ہو کر رہ گیا:۔

''معاف کیجئے گا آپ غلط جگہ پر آ گئے ہیں''

ان صاحب نے عینک صاف کرتے ہوئے فرمایا:۔

''یہاں ہر جگہ غلط ہے۔ کل سے یہی حادثہ پیش آ رہا ہے۔ ریڈیو سٹیشن ریکارڈ خریدنے جاتے ہیں تو وہ انارکلی بھیج دیتے ہیں انارکلی جاتا ہوں تو انارکلی ہی نہیں آتی انارکلی آتی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں جاؤں' اب تو میر کا وہ شعر ہی پڑھتا ہوں

اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے
کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

بعد میں معلوم ہوا کہ یہ صاحب پاگل خانہ سے بھاگ کر تشریف لے آئے تھے۔ ٹی ہاؤس میں کبھی کبھی ایسے حضرات بھی تشریف لے آتے ہیں۔

رات میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ٹی ہاؤس میں بیٹھا تھا کہ اچانک دروازے کا پردہ ہٹا اور ایک ناٹے قد کے منحنی سے آدمی اندر تشریف لائے اور ہماری میز پر آ کر بیٹھ گئے۔ وہ ہمارے دوست کے دوست تھے۔ اور شاعر تھے۔ ہمارے دوست نے پوچھا:۔

''سنائیے حضرت کیا حال ہے آج کل؟''

وہ آہ بھر کر بولے:۔

''بڑا برا حال ہے صاحب! کوئی غزل' کوئی شعر نہیں ہو رہا''

پھر فوراً ہی پلٹ کر بولے:۔

''معاف کیجئے گا آپ چائے کے وقت کھانا کیوں کھا رہے ہیں؟''

چنانچہ مجبوراً چائے بھی منگوائی گئی وہ صاحب سگریٹ پر سگریٹ لگا رہے تھے۔ اور میرے دوست کے سگرٹوں کا ڈبہ ختم ہو رہا تھا۔ وہ صاحب ہر سگریٹ کے ساتھ تازہ غزل سنانا شروع کر دیتے اور خود ہی واہ واہ کر کے جھومنے لگتے۔ تیرھواں سگریٹ سلگاتے ہوئے بولے معاف کرنا بھئی! میں سگرٹوں کا عادی تو نہیں ہوں لیکن جانے کیا بات ہے جب ڈبہ کھلا ہوا ہو تو ____ میرا مطلب ہے دوستوں میں بیٹھ کر چین سموکر ہو جاتا ہوں۔'' یہ حضرت بھی نیم پاگل تھے۔

ان کے جانے کے بعد پاگلوں اور نیم پاگلوں کا ذکر چھڑ گیا۔ ہمارے یہ دوست حال ہی میں لندن سے ڈاکٹریٹ (میڈیکل) کی ڈگری لے کر آئے تھے۔ انہوں نے لندن کے پاگل خانے کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں بتائیں۔ انہوں نے کہا کہ جب ہم پاگل خانے کے احاطے میں داخل ہوئے تو وہاں ایک درخت کے نیچے ایک خوب صورت دبلا پتلا نوجوان لڑکا دری بچھا کر لیٹا کوئی رسالہ پڑھ رہا تھا۔ ہم نے پتا کیا تو معلوم ہوا کہ وہ عرصہ گیارہ سال سے اس رسالے کا مطالعہ کر رہا ہے اور ابھی پندرھویں صفحے پر ہی پہنچا ہے۔ جب ہم نے اس لڑکے سے پوچھا کہ وہ اتنی سست رفتاری سے کیوں پڑھ رہا ہے تو کہنے لگا:۔

''جناب ایک ایک لفظ' ایک ایک ''نقطے'' پر غور کرنا پڑتا ہے۔ علم یونہی ہاتھ نہیں لگ جاتا۔''

راوی بپھرتا ہے

وہ شام برسات (چھ ستمبر) کی ایک بھیگی ہوئی شام تھی اور سارے شہر میں کئی روز سے مسلسل بوندا باندی ہو رہی تھی۔ اسی شام وسن پورہ کے ایک مچھلی فروش نے گلی میں کھڑے ہو کر پھوار کو سونگھا اور وہیں نعرہ لگایا:۔

''بھائیو! خبردار ہو جاؤ اس میں تفان (طوفان) کی بو ہے''

اور یہ طوفان دوسری رات راوی کے سیلاب کی صورت میں لاہور کی شمال مشرقی بستیوں میں آن حاضر ہوا۔ وہ مچھلی فروش کوئی ولی نہیں تھا لیکن برس ہا برس سے مچھلیوں کی صحبت میں رہنے سے اس کی قوت شامہ تیز ہو گئی تھی۔ مچھلیاں آنے والے طوفان کی خبر پا کر گہرے پانیوں میں اتر گئیں تھیں لیکن وہ مچھلی فروش اپنا بوریا بستر اٹھا کر یکی گیٹ میں آ گیا۔ پانی بڑی تیزی سے شہر کی بیرونی بستیوں کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کو دیکھ کر کسی ایسے جنگلی جانور کا گمان ہو رہا تھا جو زخمی ہو کر اپنے شکار کے تعاقب میں بھاگتا چلا جا رہا ہو۔ یہ شکار وسن پورہ' مصری شاہ' تاج پورہ' شاہدرہ اور بادامی باغ کی بستیاں تھیں لوگوں کو سیلاب کا وہم وگمان نہ تھا۔ وہ بے فکر ہو کر گھروں میں بیٹھے تھے کہ سیلاب کا پانی ان کی دہلیزوں پر سر پٹکنے لگا اور غراتے ہوئے ان کی دیواروں اور دروازوں سے ٹکرانے لگا۔ لوگ خوفزدہ ہو کر

گھروں سے باہر نکل آئے اور جلدی میں جو شے ہاتھ لگی سمیٹ کر شہر کی طرف چل پڑے۔کوچوان جیسے اس وقت کا انتظار کر رہے تھے۔انہوں نے فوراً اپنے ریٹ بڑھا دیئے۔وسن پورے سے سٹیشن تک جانے کے لئے کوئی بھی کوچوان دس روپے سے کم اجرت پر تیار نہ تھا۔لوگ مجبور تھے ایک طرف ان کی اور ان کے بال بچوں کی زندگیاں خطرے میں تھیں اور دوسری طرف کاغذ کے چھپے ہوئے ٹکڑوں کا خیال تھا۔چنانچہ کوچوانوں کی خوب چاندی بنی۔

پانی دیکھتے دیکھتے کئی فٹ چڑھ گیا۔گلی کوچوں میں کشتیاں اور ڈونگے تیرنے لگے۔عورتیں، بچے، بوڑھے اور جوان بھی پانی میں شڑاپ شڑاپ کرتے سڑکیں اور گلی کوچے عبور کر رہے تھے۔فوج ایک دم مدد پر آ گئی تھی۔فوجی جوان بادامی باغ اور سٹیشن سے لے کر شاہدرہ تک پھیل گئے تھے اور مصیبت زدہ لوگوں کو کشتیوں میں بٹھا بٹھا کر ریلوے لائن تک پہنچا رہے تھے۔ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ خالی ڈبوں کی بھی قطاریں کھڑی کر دی گئی تھیں جس میں مہاجرین پناہ گزین سو رہے تھے۔بلوں میں پانی گھس آنے سے سیلاب میل ہا میل سے زہریلے سانپ بہائے لئے چلا آ رہا تھا۔یہ سانپ پانی کے ساتھ ہی بستیوں میں گھس گئے اور ایک کہرام سا مچ گیا۔

شہر کی باقی ماندہ زندگی کے سکون میں خلل آ گیا۔میکلوڈ روڈ کے سینما گھروں میں دوسرا شو شروع ہوا ہی تھا کہ بجلی فیل ہو جانے سے فلم رک گئی۔تیسرے درجے میں گالیوں کا شور بلند ہوا:۔

''لیٹ اوئے لیٹ''

مگر لیٹ (لائٹ) کہیں بھی نہیں تھی۔نہ میکلوڈ روڈ پر نہ بیڈن روڈ پر۔مال کی سرگرمیاں ایک دم سرد پڑ گئیں۔جگمگاتے ہوئے برقی قمقموں پر ٹھنڈا ٹھار اندھیرا چھا گیا۔آن کی آن میں مال پر وسن پورہ روڈ کا گمان ہونے لگا۔سینما والوں نے کافی انتظار کے بعد

ٹکٹ کے دام واپس کر دیئے۔تماشائی دریائے راوی کو برا بھلا کہتے ہوئے سینما گھروں سے باہر آ گئے۔ایک بوڑھا آدمی کہہ رہا تھا:۔

''راوی کا کوئی قصور نہیں یہ سب ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔خدا ہم سب سے ناراض ہو گیا۔''

بوڑھا آدمی ٹھیک کہہ رہا تھا۔خدا واقعی ہم سب سے ناراض ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی لاہور کارپوریشن کے ناخدا بھی ہم سے ناراض ہو گئے تھے۔انہوں نے سمن آباد کے سرکاری لوگوں کو باہر نکالنے کے لئے ٹرک روانہ کئے اور غیر سرکاری لوگوں کو کسی نے نہ پوچھا اور وہ لوگ کچھ راوی نظر ہو گئے اور کچھ بھوکے پیاسے مکان کی چھتوں پر بیٹھے رہے۔قریبی بستیوں کے لوگ اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی مدد کو پہنچ گئے تھے۔نوجوان تیراکوں نے بھی اپنی خدمات پیش کر دی تھیں لیکن یہ مدد اس قدر قلیل تھی کہ ہجوم مصائب کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔

اندرون شہر بعض نوجوان محض تماشہ دیکھنے کے لئے بھی متاثرہ آبادیوں کا چکر لگا رہے تھے۔انہوں نے ٹوٹی پھوٹی ٹیوبیں پانی میں ڈالیں اور جھیل ڈل کی سیر شروع کر دی۔مصری شاہ کے پل کے باہر لوگوں کی ٹولیاں کھڑی تھیں۔اور سیلاب پر رائے زنی ہو رہی تھی۔ایک پستہ قد آدمی بار بار اپنی عینک سنبھالتے ہوئے پوچھ رہا تھا:۔

''ابھی پانی کتنا چڑھا ہے؟''

''کیا خطرہ زیادہ ہے؟''

''اگر زیادہ ہو تو ہم بھی انتظام کر لیں''

ایک آدمی نے تنگ آ کر پوچھا:۔

''آپ کہاں رہتے ہیں؟''

''مستی گیٹ''

دوسرے آدمی نے ناک سکیڑ کر پستہ قد آدمی کو گھورا اور تھوک کر بولا:۔

''آپ مست رہیں''

سیاسی جماعتیں بھی شاید مستی گیٹ میں رہتی تھیں کیونکہ وہ ابھی تک مست تھیں انہیں دوسرے دن ہوش آیا اور لاریوں پر چیخ چیخ کر ان کے کارندے ان لوگوں کو آگاہ کرنے لگے (سیلاب کے خطرے سے) جنہیں سیلاب کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اکثر جگہوں پر لوگ مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے۔ جب سیلاب کا پانی اتر گیا تو وہ بھی نیچے اترنے لگے۔ سیلاب گذر گیا۔ دن گذرنے لگے لیکن ابھی دو ایک روز ہی گذرے ہوں گے کہ بارشوں کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا اور پھر ایک رات دس بجے کے قریب ریڈیو پاکستان نے اعلان کیا کہ دوسرا سیلاب آرہا ہے لوگ خبردار ہو جائیں راوی کا پانی رات کی تاریکی میں ایک مرتبہ پھر اچھل پڑا تھا۔ لوگوں میں ایک دم ہراس پھیل گیا۔ یہ خبر رات کے دس بجے دریا کے قریب بستیوں کے لئے شب خون ثابت ہوئی۔ لوگ ہراساں ہو کر گھروں سے باہر نکل آئے۔ اس رات سیلاب نہ آیا لیکن بارش صبح تک ہوتی رہی اور مکانات گرنا شروع ہو گئے۔ گھروں میں اذانیں دی جانے لگیں اگر کوئی کسی سے پوچھتا:۔

سیلاب کا کیا حال ہے؟''

تو وہ منہ بنا کر بارش کی طرف اشارہ کرتا:۔

''پہلے اوپر والے سیلاب سے تو نپٹ لیں''

تیسرے روز پو پھٹے نیچے والا سیلاب بھی آگیا اور خوف و ہراس کا کھیل ایک بار پھر کھیلا جانے لگا۔ اب کی بار سیلاب کے ساتھ بارش کا طوفان بھی تھا۔ دونوں نے مل کر تباہی و بربادی کا بازار گرم کر دیا۔ اس سیلاب کی نوعیت پہلے سے زیادہ شدید تھی۔ لوگوں کو ایک بار پھر اپنا بوریا بستر باندھنا پڑا اور انہیں یقین ہو گیا کہ قیامت قریب آگئی ہے۔ اس عرصہ میں کامران کی بارہ دری میں چند رنگین طبع نوجوانوں کو پک نک مناتے ہوئے بھی دیکھا گیا۔ بیڈن روڈ پر ایک مکان کی بالائی منزل بازار میں آن گری۔ مصری شاہ میں ایک مکان رات کو گر پڑا

اور اپنے ساتھ تین بچوں کو لے گیا۔ دو موریا پل کے باہر ایک گھڑی ساز بس کا انتظار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''یہ سب کچھ کوریا کی جنگ کی وجہ سے ہو رہا ہے''

دوپہر تک پانی کئی فٹ چڑھ گیا اور مکانوں کی پہلی منزلیں دیکھتے دیکھتے زیر آب ہو گئیں۔ یہ سیلاب واقعی پہلے دو سیلابوں سے بازی لے گیا تھا۔ راوی کا پانی کئی اطراف سے شہر پر حملہ کر رہا تھا۔ شام کو پانی کی رفتار بڑھ گئی تھی۔

شیرانوالہ گیٹ کے باہر تین آدمی باغ کے بنچ پر بیٹھے تھے اور ان کے پاس ہی قربانی کا دنبہ لیٹا تھا جس پر مہندی سے لکھا ہوا تھا:۔

پہلا آدمی کہہ رہا تھا۔

''خدا کرے بجلی آجائے''

دوسرا کہہ رہا تھا۔

آجائے گی۔ میں نے پتہ کر لیا ہے آج برسات کا ایک شو ہے''

دوسری طرف ہر تدبیر الٹی پڑ رہی تھی۔ یونیورسٹی گراؤنڈ جھیل کا منظر پیش کر رہی تھی۔ سیلاب کا پانی سکریٹریٹ کی دیواروں کو سہلا رہا تھا۔ اسی رات بجلی کی کڑک اور بادلوں کی گرج کے ساتھ ایک زبردست طوفان آیا۔ لوگوں کے دل ہل گئے وہ سراسیمہ ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

''بھائیو چودھویں صدی کے بعد قرآن میں کسی صدی کا ذکر نہیں۔ یہ قیامت کے آثار ہیں۔''

اس رات سارا شہر چپ اور ویران رہا۔ ریڈیو بند رہے کسی گھر میں کوئی نہ سو سکا۔ الصبح جب سورج کی کرنیں بیدار ہوئیں تو لوگوں نے بے تابی سے گلیوں میں جھانک کر دیکھا:۔

''پانی اتر رہا ہے۔''

''پانی اتر رہا ہے۔''

پانی واقعی اتر رہا تھا لیکر آہستہ آہستہ۔۔۔۔شام تک اکثر سڑکوں پر سے پانی پھر واپس چلا گیا۔ ایک باغبان نے بتایا کہ مالٹوں کے سارے باغ تباہ ہو گئے ہیں۔ ایک کسان نے کہا:۔

''پانچ کی توریاں بوئی تھیں جن کا نشان نہیں مل رہا۔ ہمارا تو اللہ ہی بیلی ہے۔''

''ہمارا بھی اللہ ہی بیلی ہے بابا''

سیلاب نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا تھا۔ مال اور میکلوڈ کی زندگی بھی بجھی بجھی تھی۔ میٹرو میں ''مچھیرا ڈانس'' کا پروگرام تھا۔ مگر بجلی فیل ہو جانے سے کوئی مچھلی نہ اچھل سکی۔ رقص گاہوں سے ابھرنے والے گانوں کی آواز میں سیلن تھی۔ اور یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے رقاصہ پانی میں ناچ رہی ہو۔

دوسرے روز عید تھی۔ اس عید کا استقبال لوگوں نے سرد مہری سے کیا۔ اس لیے کے شہر کی تقریباً نصف آبادی اپنے گھروں سے بے گھر ہو کر عارضی کیمپوں میں پناہ گزین تھی۔ مال میکلوڈ اور بیڈن روڈ کا لاہور' مصری شاہ' وسن پورہ' فیض باغ اور بادامی باغ کے لاہور سے بالکل کٹ چکا تھا۔ مصری شاہ اور وسن پورہ میں مصیبت زدہ عورتیں گھٹنوں تک پانی میں ڈوبی افتاں وخیزاں اپنے مکانوں کی طرف رواں تھیں۔ اور میکلوڈ روڈ پر لوگ عید کی خوشیوں میں سرشار سینما گھروں کے باہر اژدہام کی صورت میں ٹکٹ خرید رہے تھے۔

شمال کی طرف سے لاہور بیرونی دنیا سے الگ ہو چکا تھا۔ چنانچہ اب کی دفعہ عید کراچی کی طرف سے آئی اور مال پر سے ہوتی ہوئی میکلوڈ روڈ تک آ کر وہیں رک گئی۔ کیونکہ آگے سیلاب تھا پریشانی دور ماندگی تھی بے گھر لوگوں کے آنسو تھے۔ اور درختوں تلے کھڑی چار پائیوں کی اوٹ میں پڑے ہوئے شریف گھرانے تھے۔ عید وہاں کیسے پہنچ سکتی تھی۔ چنانچہ اس موٹر کی طرح جس کا پٹرول ختم ہو گیا ہو۔ عید کا یہ ریلہ بھی وہیں پر رک گیا۔

شہر کی چار دیواری کے اندر لوگوں نے عید کا استقبال معتدل گرم جوشی سے کیا۔ انہوں نے عید سے مصافحہ کیا اور اپنے اپنے کام میں لگ گئے موچی' دہلی اور بھاٹی کے باہر باغوں میں سارا دن میلہ سا لگا رہا۔ پنگوڑے سے جھول رہے تھے۔ سنری تھیٹریکل کمپنیاں ڈھول تاشے پیٹ رہی تھی۔ مٹھائی اور قلفے کی دکانوں پر بھیڑ تھی۔ حلوائی دھندلی آنکھوں میں سے بہتا ہوا پانی بار بار پونچھ رہا تھا اور گاہکوں میں سودا بانٹ رہا تھا۔

گوٹہ لگے کیسری اور سرخ کپڑوں والی بچیاں دوربین کی مدد سے انگریزی سینریاں دکھانے والے کے گرد جمع تھیں۔

دوکاندار ایک آنہ جیب میں ڈال کر دوربین بچی کی آنکھوں میں لگا دیتا ہے۔

''روس دیکھو''

''ترکستان دیکھو''

''دریائے جہلم دیکھو''

''کراچی شہر دیکھو''

ترکستان سے لے کر دریائے جہلم تک اس کے پاس کئی ایسی تصویریں تھیں جو بچوں کا دل لبھا سکتی تھیں۔

بعض بچے تصویروں کو حیرت سے دیکھتے اور بعض خوشی میں تالیاں پیٹتے تھے۔

سامنے ایک آدمی چینی کے خوب صورت کھلونے بیچ رہا تھا۔

ہاتھی' گھوڑے' بلیاں' مچھلیاں' طوطے' کبوتر' آدمی ہر شے کھانڈ کی تھی۔

ہر ایک مال دو پیسے میں۔

ہاتھی اور آدمی۔۔۔دونوں دو پیسے میں۔

بچیاں کبھی ہاتھی کھا رہی تھیں اور کبھی آدمی۔

دوسری طرف ریل کی پٹری پر چھوٹے چھوٹے ڈبے گھوم رہے تھے۔ جب گاڑی چھوٹتی تو

لڑکیوں کے رنگین آنچل، بچوں کے ریشمی گلوبند اور بوڑھوں کے بسنتی رومال ہوا میں لہرانے لگتے۔ تھیٹریکل کمپنی کے دروازے پر ایک مچان لگی تھی جس پر چارلی لوگوں کو ہنسانے کے لیے عجیب عجیب حرکتیں کر رہا تھا۔

ان حرکتوں کو دیکھ کر بچوں کے پیٹ میں مارے ہنسی کے بل پڑ رہے تھے۔ کسی وقت وہ تماشائیوں کے استقبال کو ہوا دینے کی خاطر گیٹ کا پردہ اٹھا کر انہیں تھیٹر کے کسی منظر سے لطف اٹھانے کی عام اجازت دے دیتے بچے اور بچیاں بڑی بڑی آنکھیں کھول کر اندر جھانکتیں۔

دور۔۔۔۔۔۔سٹیج پر تین چار عورتیں منہ پر پاؤڈر تھوپے ایک قطار میں کھڑی کولہے مٹکا مٹکا کر گا رہی ہوتیں"

جیا بے قرار ہے آئی بہار ہے

آجا مورے بالما تیرا انتظار ہے

بچے زور سے تالیاں پیٹتے اور جب تھیٹر والے دوبارا پردہ گرا دیتے تو ہجوم میں سے نوے فی صد آدمی ٹکٹ خرید کر اندر چلے جاتے اور بچے گیس بھرے رنگین غبارے خریدنے میں معروف ہو جاتے۔

بچیاں غبارے چھیننے کے لیے ایک دوسری کے پیچھے بھاگ رہی تھیں کسی کے ہاتھ سے جب کوئی غبارہ چھوٹ جاتا تو سینکڑوں معصوم چہرے اوپر آسمان کی طرف اٹھ جاتے۔

او رنگین غبارے:

ہمیں بھی ساتھ لیتا چل!!

سڑکیں اور کتبے

لاہور کی سڑکوں کے نام تبدیل کیے جا رہے ہیں۔

جیل روڈ کا نام گلبرگ روڈ اور مال کا نام "شاہراہ" تجویز ہوا ہے۔ ہمارے خیال میں لاہور کی سڑکوں کو نام دیتے ہوئے اگر ہمارے ادیبوں اور شاعروں کو نظر انداز کر دیا گیا تو یہ زیادتی ہو گی کچھ سڑکیں ایسی ہیں جن کا ہمارے ادب سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مثلاً بیڈن روڈ کا نام منٹو روڈ رکھا جائے۔ نسبت روڈ کا نام قاسمی روڈ۔ شاہی محلے کا نام "ٹھنڈا گوشت" اور راوی روڈ کا نام بعینہٖ چغتائی روڈ رکھا جائے۔ ہسپتال روڈ کا نام "ہائے اللہ" روڈ ہو اور ٹمپل روڈ کا نام "میرے بھی صنم خانے ہو" میکلوڈ روڈ کو ہم بلاشبہ "خالی بوتلیں خالی ڈبے" کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ اس سکیم پر عمل کرنے سے نہ صرف یہ کہ سڑکیں زندہ رہیں گی بلکہ یہ شہر بھی کبھی نہ مٹ سکے گا ادیبوں کو زندہ جاوید کرنے کے ساتھ ان کی موت پر کتبوں کا کام بھی نہایت ضروری ہے جو ان کی ادبی شخصیتوں کے آئینہ دار ہوں۔ مثلاً اگر قیوم نظر کے کتبے پر یہ لکھا ہو "از راہ کرم فاتحہ خوانی کرتے جانا۔ تو یہ نہ صرف قیوم نظر بلکہ اس کی شاعری کی بھی توہین ہو گی۔ یہاں نمونے کے طور پر کچھ کتبے درج کیے جاتے ہیں جن پر متعلقہ حضرات کو ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا چاہیے۔

قیوم نظر

''لورا مرنہ سکا''

ابن انشا

''یہاں چینی کی چائے دانی دفن ہے''

شہرت بخاری

''شہرت شب فراق ہے جی بھر کے روئیے''

سعادت حسن منٹو

''خالی بوتل خالی ڈبہ''

ناصر کاظمی

''مارے گئے''

ظہیر کاشمیری

''سیاں نے انگلی مروری رے''

انتظار حسین

آج وہ محاوروں کی تلاش میں بہت دور نکل گیا۔

کچھ عوامی کتبے بھی تجویز کئے جاتے ہیں۔ جن سے حسب توفیق فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

فلم ڈائریکٹر کا کتبہ

''کٹ''

ڈرائیور کا کتبہ

''ڈیڈ سلو''

ملا کا کتبہ

''وہ حلوے پر سے پھسل پڑے''

نیوز ایڈیٹر کا کتبہ

''سٹاپ پریس''

انارکلی ماڈرن مال کی مشہور منڈی ہے۔ کچھ دن گذرے ہمارے ایک دوست نے ایک دوکان پر سے اپنے بچوں کے لیے کپڑا خریدا۔ دوکان دار نے پھرکی کی طرح گھومتے ہوئے کہا۔

''اصلی جرمن کپڑا ہے۔ یہ دیکھئے جرمنی کی مہر۔ بالکل پکا رنگ ہے اس کا''

جب کپڑا دھویا گیا تو کپڑے کا سارا رنگ اتر گیا۔ لیکن مہر کا رنگ جوں کا توں رہا۔

مکانوں کی الاٹ منٹ کے سلسلے میں بڑے بڑے دل چسپ لطیفے ہوئے ہیں۔ قلعہ گوجر سنگھ میں ایک گوجر خاندان کو جو مکان ملا اس میں یہ لوگ صوفوں پر گھڑے رکھا کرتے تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ گھڑے صوفوں پر کیوں رکھتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا۔

''ان پر گرنے کا ڈر نہیں ہوتا''

ہمارے ایک بزرگ کو لاہور کی خوبصورت آبادی میں ایک فلیٹ مل گیا باقی تفصیلات انہی کی زبانی سنیے۔

''جب میں اندر کمرے میں داخل ہوا تو اندر ہر طرف آئینے لگے ہوئے تھے جدھر نگاہ اٹھا کر دیکھتا ہوں بس میں ہی میں تھا۔''

چنانچہ آپ نے سوائے ایک کے باقی تمام آئینوں پر پردے ڈال رکھے ہیں۔ اس کمرے کا فرش اس قدر چمکیلا تھا کہ آپ کئی مہینوں تک صبح بستر سے اٹھ کر فرش کی طرف دیکھ کر بال درست کیا کرتے تھے۔

کچا نسبت روڈ کے چوک میں ایک مسجد کے عقب میں تین چار جھونپڑیاں تھیں۔ ان

جھونپڑیوں میں سڑکوں پر پتھر کوٹنے والے رہتے تھے۔ نمازیوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر محلے والوں نے مسجد کی توسیع کا فیصلہ کرلیا۔ اگرچہ ایک اور مسجد پاس ہی تھی لیکن اپنے محلے کی مسجد اپنے محلے کی مسجد ہوتی ہے۔ اس کا بھی کچھ حق ہوتا ہے۔ چنانچہ جھونپڑیاں گرا کر مسجد کے صحن میں سجدہ کرتے ہوئے کسی نمازی کو ان پتھر کوٹنے والے بچوں کی بلکتی ہوئی آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔

ایک مشہور یونانی دواخانے کے برآمدے میں ایک انتہائی نحیف اچکن پوش جن کا رنگ سیاہ اور آنکھیں زرد تھیں کھڑے بیڑی پی رہے تھے اور ان کے اوپر دوکان کی پیشانی پر لکھا تھا۔

''پاکستان کی جڑی بوٹیوں کی حفاظت ہمارا فرض ہے''

ریلوے روڈ پر باٹا کی ایک دوکان میں ایران کے صوفی شاعر شیخ سعدیؒ کی تصویر ٹنگی ہے۔ اس تصویر میں شیخ سعدیؒ باٹا کے سفید جوتے پہنے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔

نیچے یہ حکایت درج ہے۔

''کسی نے شیخ سعدیؒ سے پوچھا کہ آپ نے چلنا پھرنا کہاں سے سیکھا آپ نے فرمایا۔ باٹا کے جوتوں سے''

مئی کی ایک دوپہر کو لاہور کے ایک منفرد شاعر میکلوڈ کے چوراہے میں کھڑے تھے کہ ایک سپیرا بین بجاتا وہاں سے گذرا آپ نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک لیا:۔

''بھیرویں آتی ہے؟''

''جی ہاں''

''تو دو آنے کی بھیرویں سناؤ''

اور باذوق سپیرا کتنی ہی دیر بدذوق شاعر کو شدھ سارنگ سناتا رہا اور شاعر بھیرویں سمجھ کر سر

ہلاتے رہے۔

لاہور کی ایک شاندار اور مشہور عمارت کے دروازے پر جلی حروف میں لکھا ہے:

''بلیک مارکیٹ ختم کرنے کا واحد ادارہ''

ہمارے خیال میں لاہور کی تمام بلیک مارکیٹیں اسی عمارت میں آکر ختم ہوتی ہیں جس طرح عید میلاد کے جلوس گول باغ میں آکر ختم ہوا کرتے ہیں۔

انارکلی کے ایک ہوٹل میں کچھ دوستوں کے درمیان سیاسیات پر بحث ہو رہی تھی۔ ایک صاحب ہر پارٹی کی حمایت کر رہے تھے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ کس پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں۔ تو انہوں نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔''

''ٹی پارٹی سے''

پتہ چلا کہ وہ صاحب کسی زمانے میں کانگریسی تھے۔ پھر یونی نسٹ ہو گئے۔ بعد میں کیمونسٹ پارٹی میں شامل ہو گئے۔ پھر لیگ میں آئے اور آجکل جناح عوامی لیگ میں ہیں۔ جناح عوامی لیگ کی طرح ان صاحب کا بھی جناح اور عوام سے کوئی تعلق نہیں۔

وہ صرف لیگ ہے۔ محض لیگ۔ ایک پھندنا جس کے نیچے ٹوپی غائب ہو۔ ایک ٹوپی جس کے نیچے کوئی سر نہ ہو۔ ایک سر جس کے اندر دماغ کی جگہ معدہ ہو۔'

لاہور شہر میں رات بھر بارش ہوتی رہی ہے۔ سردیوں کی بارش بڑی نرم اور کیچڑ افزا ہوتی ہے۔ رات جب مینہ برابر پڑ رہا تھا۔ مصری شاہ میں بیاہ کا شادیانہ گونج اٹھا ایک تنگ سی گلی میں بینڈ والے مشہور فلمی گانا بجانے لگے۔

جیا بے قرار ہے چھائی بہار ہے
آجا مورے بالما تیرا انتظار ہے

لیکن بالا مصری شاہ کے کیچڑ اور دلدل سے گھبرا رہا تھا۔ اور پل کے قریب کھڑا انتظار کی گھڑیاں مرمت کر رہا تھا۔ اگر چہ مصری شاہ کے بازاروں اور گلیوں میں بہار چھائی تھی اور جیا بھی بے قرار تھا۔ لیکن گھٹنے گھٹنے کیچڑ کے اندر چھپی ہوئی بہار کون دیکھے؟

کنہیا لال کپور نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ اگر آپ ریڈیو خریدنا چاہتے ہیں تو اسے اپنے گھر نہ رکھیں بلکہ ہمسائے کے گھر میں رکھیں اور سنیں اسمیں کوئی شک نہیں کے ہمسائے کے گھر کی دال بھی مرغی برابر ہوتی ہے اور لاہور شہر میں جس گھر میں ریڈیو ہے وہاں کے رہنے والوں کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو سنایا جاسکے اس کے باوجود میرے محلے میں ایک صاحب ہیں جو اپنا ریڈیو اس قدر دھیما لگاتے ہیں کہ ان کے بچے کان لگا کر سنتے ہیں۔

ان کے ساتھ والے گھر میں ایک لوہار رہائش پذیر ہیں جن کا کام منڈیوں کے بھاؤ سننا اور اس کے بعد ڈھونڈ ڈھانڈ کر کہیں نہ کہیں سے قرآن کی تلاوت سننا ہے۔ کل رات جب بڑی رومانٹک رم جھم ہو رہی تھی آپ سوئی گھماتے گھماتے ۔۔'' کہیں جالندھر سٹیشن پر پہنچ گئے۔ سریندر کور اور پرکاش کور گا رہی تھیں۔

ڈھول سپاہیا وے
کتھے گھوں دل لا کے

ایک زوردار دھماکہ ہوا اور کوئی صاحب بولنے لگے۔

''۔۔۔۔۔۔ یو این او میں پیش کردہ تازہ تجویز پر عبرانی نمائندے نے اسرائیلی سٹیٹ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

پھر ایک زوردار دھماکہ ہوا اور آواز آئی۔

''لوکی پانچ روپے' چقندر اصلی بارہ روپے اور شکر قندی' یارکند کی تین روپے اور ۔۔۔۔۔

تیسرا دھماکہ ہوا۔۔

اس کے بعد کوئی گڑ بڑ اور دھماکہ نہ ہوا۔

کاش مجھے کنیا لال کپور مل جائے۔ کاش ایک اور ہو جائے۔

دو تین دن گذرے پاکستان کی مشہور فلم ایکٹریس نور جہاں اپنے خاوند کے ساتھ شاپنگ کرنے انار کلی آئی۔ اس نے برقعہ اوڑھ رکھا تھا۔ بازار میں سے گذرتے ہوئے کہیں اس نے نقاب الٹ دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ سارا معاملہ الٹ ہو گیا۔ قریب سے گذرتے ہوئے ایک عینک پوش کلرک نے اسے دیکھا۔ اور اس کی عینک کانپ گئی ______

''نور جہاں؟''

اس نے اپنے ساتھی کو اس طرف متوجہ کیا۔ اس کے ساتھی نے تیسرے ساتھی کو متوجہ کیا۔ اور تیسرے نے چوتھے کے کان میں کہا۔ ان کے پیچھے دو اور نوجوان چلے آ رہے تھے۔

''نور جہاں جا رہی ہے؟''

جوتا پالش کرنے والا طالب علم چونکا

''نور جہاں؟''

ہاں۔ نور جہاں۔ دانتوں کا منجن خریدتے ہوئے ایک آدمی نے بڑی خوشی سے سر ہلا دیا۔ دیکھتے دیکھتے ساری انار کلی نور جہاں کے پیچھے پیچھے ہو لی۔ پہلے وہ انار کلی میں سے جا رہی تھی اور اب انار کلی اس کے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ بوٹوں کی ایک دوکان میں گھس گئی۔ باہر لوگوں کا ہجوم کھڑا تھا اور اسے بلا رہا تھا۔ اور زور زور سے پکار رہا تھا۔ نور جہاں۔ نور جہاں ۔۔۔ جب وہ باہر نہ نکل سکی تو مجبوراً پولیس کو فون کرنا پڑا جس نے بڑی مشکل سے ہجوم پر قابو پایا اور وہ بے چاری لوگوں سے اپنی جان بچا کر بھاگ گئی۔

ہمارا خیال ہے۔شاید اب نور جہاں کبھی انارکلی سے نہ گذرے اور اگر آ گئی تو کم از کم نقاب نہیں اٹھائے گی اور اگر اس نے نقاب اٹھا دیا تو پھر وہ کبھی انارکلی نہیں آئے گی۔

گذشتہ رات لاہور کے ایک مقامی سینما ہال کے باہر بے پناہ رش تھا۔تھرڈ کلاس ٹکٹ گھر کے باہر لوگ کھڑکی تک پہنچنے کے لیے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے اور قطار بندی کا ہفتہ منا رہے تھے۔کچھ لوگ دیوار سے چھلانگ لگا کر ہجوم کے سروں پر سے ہوتے ہوئے کھڑکی کے پاس پہنچے اور ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

سیکنڈ کلاس ٹکٹ گھر میں کچھ اور ہی منظر تھا۔

تماشائیوں کا ہجوم ایک ہی لمبی قطار بنا کر ٹکٹ لے رہا تھا اور دھکم پیل کی وجہ سے ساری قطار کبھی سمٹ رہی تھی اور کبھی پھیل رہی تھی۔کبھی آگے جا رہی تھی اور کبھی پیچھے آ رہی تھی' کچھ لوگ دوسری طرف سے کھڑکی پر حملہ کرنے کی فکر میں تھے۔جنہیں لوگوں نے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

''آپ لوگ قطار میں کیوں نہیں آتے؟''

چنانچہ ان لوگوں نے اپنی ایک الگ قطار بنائی اور پہلی قطار کو توڑنے کی جدوجہد کی دونوں قطاروں میں قطار اندر قطار جنگ چھڑ گئی۔دوسری طرف سے رضاکاروں کا ایک دستہ بھاگتا ہوا آیا اور قطار بنا کر ان دونوں قطاروں میں بیچ بچاؤ کرنے لگے۔ایک کم عمر رضاکار کے مکا لگا اور وہ قطار سے نکل کر کھمبے کے پاس بیٹھ گیا اور زار و قطار رونے لگا۔دوسرے رضاکار نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''نہ رو میرے بھائی''

قطاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں!
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں!

لاہور کے محلے میں ایک مٹھائی فروش کی دوکان ہے۔جو بناسپتی گھی سے مٹھائیاں تیار کرتا ہے۔اس نے دوکان پر چھوٹا سا بورڈ لکھوا رکھا ہے۔

''یہاں خالص بناسپتی گھی سے مال تیار ہوتا ہے۔

ہر تہوار یا میلے پر وہ اپنی دوکان خوب سجاتا ہے۔مٹھائیوں سے بھرے ہوئے تھال اوپر تک چلے گئے ہوتے ہیں اور ان میں ایک تھال کے پیچھے وہ بناسپتی گھی والا بورڈ بھی چھپ جاتا ہے۔

کل پرسوں سے ہمارے محلے کی ایک بزرگ وضعدار خاتون نے اخباروں میں اپنی خبر نکلوانے پر بڑا زور دے رکھا ہے۔راقم الحروف جب بھی وہاں سے گذرتا ہے وہ ضرور یاد دہانی کرا دیتی ہے۔

''آج وہ خبر ضرور دے دینا بیٹا''

وہ خبر یہ ہے کہ اس خاتون نے اپنا نام پاکستان میں تبدیل کر لیا ہے ان کا پہلا نام غلام فاطمہ تھا اور اب آزاد فاطمہ ہے۔

ہندوستان کے ایک فلمی ہفت روزہ نے اپنی تازہ اشاعت میں مشہور پلے بیک سنگر لتا منگیشکر کی مختصر سوانح عمری شائع کی ہے جس میں اخبار نے لکھا ہے کہ وہ مہاراشٹر کے ایک شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں ان کا باپ تھیٹر میں ملازم تھا اور گانے بجانے میں ماہر تھا۔لتا نے موسیقی کی تعلیم اپنے باپ سے حاصل کی بعد میں وہ مشہور ہو گئی اب وہ بمبئی میں ہے اور دن رات کام کرتی ہے اور اپنے باپ کا پیٹ پالتی ہے۔اخبار نے باقی سب کچھ ٹھیک لکھا ہوگا۔راقم الحروف کو آخری فقرے پر اعتراض ہے یہ فقرہ ہونا چاہیے تھا اور اب اپنے باپ کا پیٹ موٹا کرتی ہے۔

راقم الحروف کے مکان کے آگے سے ایک پھیری والا بلا ناغہ دن کے بارہ بجے یہ آواز لگاتا گذرتا ہے۔

لاؤ کوئی خالی بوتلیں، خالی ڈبے

"کیوں صاحب یہ کتاب آپ نے لکھی ہے"

وہ گردن کھجلانے لگا اور ذرا جھینپتے ہوئے بولا۔

"یہ شغل بھی کرتے ہی رہتے ہیں"

اب منٹو کو کوئی اور شغل اختیار کرنا چاہیئے۔

میں بھی حاضر تھا وہاں

اور میرے علاوہ وہاں اخباروں کی روی خریدنے والے بھی تھے، محفل نقاد کا انتظام چونکہ پنجاب یونین کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس لئے وہاں غل غپاڑہ شروع سے آخر تک قائم رہا۔ مجلس کی صدارت جن صاحب کے سپرد تھی۔ جو پورے دو بجے ہاکرز مارکیٹ کے پنڈال میں تشریف لائے جب وہ کار سے باہر نکلے تو ان کے گلے میں نوٹوں کا ہار ڈالا گیا۔ اس ہار میں پھول بھی تھے۔ لیکن روپے روپے والے نوٹ زیادہ تھے۔ جس وقت یونین کے جنرل سیکرٹری ہار لے کر صحافیوں کی منڈلی کے قریب سے گذرے تو کسی من چلے نے فقرہ چست کیا:۔

"اک نوٹ ہمیں دلا دے، پھر میری توبہ"

صاحب صدر کرسی صدارت پر تشریف فرما ہوئے تو سیکرٹری صاحب سپاس نامہ پڑھنے لگے وقت بارہ بجے کا تھا۔ دو پہلے ہی بج گئے تھے، مہمانوں کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔

ایک آدمی نے ایک دوڑتے ہوئے چوہے کو دم سے پکڑ کر باہر نکال لیا:۔

"ہت تیرے چوہے کی دم میں نمدا، بچ کر کہاں جائیگا۔"

سپاسنامے نے طول پکڑا تو لوگ جمائیاں لینے لگے۔ ایک پہلوان نے اتنی لمبی چوڑی جمائی

لی کہ وہ کرسی پر سے نیچے گر پڑے' سیکرٹری صاحب لہک لہک کر سپاسنامہ پڑھ رہے تھے۔ اور ان کی ٹوپی کا پھندنا جھوم رہا تھا۔

حضرات جس وقت لوگ بستر استرا پر خواب خرگوش کے مزے لے رہے ہوتے ہیں۔ اور بارش کی رم جھم ہو رہی ہوتی ہے۔ اور بادصرصر کے جھونکے جھوم رہے ہوتے ہیں' اور آندھیاں' اٹھکیلیاں کر رہی ہوتی ہیں۔ اس وقت بے چارے ہاکرز بازار میں اخبار بیچ رہے ہوتے ہیں حضرات اس وقت جنگ کے اندھیرے چاروں طرف چھا رہے ہیں۔ اور کہیں سے لائٹ کی ایک کرن بھی نہیں آ رہی' حضرات! یہ وقت بڑا عذاب ہے۔

صرف اخبارات ہی آپ لوگوں کو حالات سے باخبر رکھتے ہیں۔

اور حضرات۔۔۔۔؟''

لیکن حضرات کا برا حال تھا۔ اور تقریباً ہر آدمی کی نظریں قناتوں کے اس پار اٹھ رہی تھیں جہاں پلاؤ کی دیگیں دم ہو رہی تھیں اور بیرے سفید کوٹ زیب تن کر رہے تھے' سیکرٹری صاحب نے سپاسنامہ ختم کیا تو صاحب صدر نے ایک مختصر سی جوابی تقریر فرمائی اور بیٹھ گئے' لیکن ابھی دلی دور تھی۔۔۔ ابھی ایک مولوی صاحب کو اپنے ارشادات عالیہ پیش کرنے تھے۔ انہوں نے سٹیج پر تشریف لاتے ہی سپاٹ انداز میں درود پڑھا اور پھر خاص مولویانہ لہجے میں تقریر شروع کر دی۔

مولوی صاحب عربی زبان پر کافی عبور رکھتے ہیں۔ ویسے بھی ایک مسجد کے خطیب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی تقریر کے دوران میں انہوں نے لفظ معہ (الکریم وتشدید ضا) کو من سا پڑھا' کم از کم میں مولوی صاحب کا بہت شکرگزار ہوں۔ کہ انہوں نے ایک لفظ کی تصحیح فرمائی جسے میں ایک عرصے سے غلط بولا کرتا تھا انہیں چاہئے کہ ایسے تمام الفاظ کو ایک جگہ جمع کر کے ان کی تصحیح فرمائیں اس میں ان کی بھلائی ہے۔ اور قوم کی بھی' آخر میں آپ نے یوں حق نمک ادا کرنے کی کوشش کی:۔

''بھئی ہم تو پرانی ٹائپ کے لوگ ہیں' وہ پرانی لیگ''

میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک صحافی نے کہا۔

''خواہ پرانی ہا سکتی ہو''

مولوی صاحب بیٹھے تو صاحب صدر کھڑے ہو گئے۔ اور انہیں اٹھتا دیکھ کر کھڑے لوگ بیٹھ گئے اور بیٹھے ہوئے لیٹنے کی کوشش کرنے لگے۔ صدر کو دیکھ کر اکثر لوگوں کی بھوک تیز ہو گئی تھی۔ آپ نے اپنی تقریر پاکستان سے دس ہزار میل کے فاصلے پر جا شروع کی اور چھوٹتے ہی فرمایا:۔

''حضرات پچھلے دنوں میں آسٹریلیا گیا ہوا تھا۔ کچھ حضرات پر واقع غشی کی حالت طاری ہو گئی' کیونکہ آسٹریلیا سے تقریر کرنے والا مقرر پہنچتے پہنچتے ہی پاکستان پہنچتا ہے۔ اور تین بج رہے تھے۔ اور دوسری طرف اب پلاؤ کی گرم گرم خوشبو بھی پنڈال میں چہل قدمی فرما رہی تھی۔ حضرات جب میں سڈنی کے دفتر میں پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں۔ کہ اخبار چھپ رہا ہے۔ خود بخود کٹ رہا ہے۔ خود بخود فولڈ ہو رہا ہے۔

ایک دبی آواز:۔ اور خود بخود دفتر سے باہر نکل رہا ہے۔

دوسری آواز:۔ اور خود بخود لوگوں کے گھروں میں جا رہا ہے۔

تیسری آواز:۔ خود بخود وہاں ناشتہ کر رہا ہے۔ یہ آوازیں ایک خاص میز پر بلند ہو رہی تھیں۔ اس لئے صاحب صدر کی تقریر مخل نہ ہو سکیں وہ بدستور ہاتھ اٹھا اٹھا کر گرج رہے تھے۔

حضرات میں دل و جان سے آپ کے ساتھ ہوں۔ اور آپ لوگوں کی کامیابی کو ملک اور قوم کی کامیابی کا پیش خیمہ سمجھتا ہوں۔

حضرات یہ جمہوریت کا زمانہ ہے۔ سرمایہ داری کا نظام ختم ہو رہا ہے۔ اب ہر طرف ساوات کا عالم ہے۔ خدا کی قسم حضرات یہاں سے جھوٹ چلا گیا ہے۔

ایک آواز:۔آخر وہ بھاگ کر کدھر گیا ہے؟

دوسری آواز:۔سنا ہے۔صاحب صدر کے گھر گیا ہے۔ابھی تک واپس نہیں آیا۔

صاحب صدر کی تقریر زندہ باد کے نعروں پر ختم ہوگئی۔اب کھانا تقسیم ہونا شروع ہوا۔اور بالکل الٹ طریق سے ہوا یعنی پہلے میزوں پر فرنی کی پلیٹیں تقسیم کی گئیں۔جو ہماری میز پر تو ایک ہی جگہ جمع ہوگئیں۔میرے بالمقابل ایک مشہور پھل فروش پہلوان بیٹھا تھا۔جس نے کثرت کرنے کے بعد صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔چنانچہ فرنی کی دو پلیٹیں آتے ہی غائب ہوگئیں۔پہلوان خالی پلیٹوں کو یوں گھور رہا تھا۔جیسے کہہ رہا ہو:۔

کاش تم مٹی کی پلیٹیں نہ ہوتیں۔

لیکن پہلوان کی بدقسمتی کہ پلیٹیں اس کی پھولی ہوئی توند کی طرح کی بنی ہوئی تھیں فرق صرف اتنا تھا کہ پہلوانوں کی توند ذرا گیلی تھی۔اور پلیٹیں خشک ہو چکی تھیں فرنی کے بعد دہی کے کٹورے آگئے۔پہلوان نے اپنا کٹورا پی کر اپنے ساتھی کا کٹورا اٹھاتے ہوئے کہا:۔

دہی فرنی کو فوراً ہضم کر دیتا ہے۔

اس کا ساتھی اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر کر بولا:۔

مگر دہی کو کون سی شے ہضم کرے گی۔

پہلوان نے مونچھیں دھوتی کے پلو سے پونچھتے ہوئے کہا:۔

''بریانی''

لیکن بریانی اس وقت آئی۔جب مہمانوں میں چمچ اٹھانے کی بھی سکت باقی نہ رہی تھی۔اور شوربہ اس وقت آیا جب بریانی ختم ہو گئی تھی اور

جب شوربہ ختم ہوا تو مولیاں آگئیں۔

مشہور پھل فروش نے بیل کی مانند مولیاں چرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

مجھے تو آج دو روپے کی ڈز پڑ گئی ہے۔

جب دعوت ختم ہوئی تو مہمان مولیاں کھاتے پنڈال سے باہر نکل آئے اور ٹولیوں کی صورت میں اپنی اپنی راہ ہوئے۔

فرش پر قالین بچھے تھے۔قالینوں اور کرسیوں پر اخبارات تشریف فرما تھے درمیان میں میزوں کی قطار لگی تھی۔جن پر انواع واقسام کی مٹھائیاں چنی ہوئی تھیں۔مٹھائیاں مہمانوں کو خوف زدہ نگاہوں سے تک رہی تھیں اور مہمان مٹھائیوں کو للچائی ہوئی ٹکٹکیوں سے گھور رہے تھے۔صاحب صدر کے دونوں جانب دو ٹولیاں اپنی اچکنوں اور صوفوں کے باعث عوام میں حد امتیاز قائم کر رہی تھیں۔دیواروں پر آمنے سامنے بی۔او۔اے۔سی کے رنگین اشتہار چسپاں تھے۔ایک اشتہار پر نیم عریاں یورپین دوشیزہ ساحل سمندر پر کھڑی ایک بازو اوپر اٹھائے مسکرا رہی تھی نیچے لکھا تھا:۔

come on in

دوسرے اشتہار پر ایک ایر ہوسٹس ہوائی جہاز سے نیچے اترتے ہوئے مدیران کرام کو متبسم نگاہوں سے تک رہی تھی۔اور نیچے لکھا تھا:۔

B.O.A.C.zaher good care of you

بی۔او۔اے۔سی کے جہاز آپ کی پوری حفاظت کرتے ہیں۔

اور جنرل سیکرٹری فرما رہے تھے۔کہ ہماری جماعت آپ کے تحفظ کا پورا ذمہ لیتی ہے۔تحفظ کی دعوت دونوں جانب تھی۔فرق صرف اتنا کہ ایک کے سر پر خوبصورت چھوٹی ٹوپی تھی اور دوسرے نے کلاہ پہن رکھا تھا۔میری بائیں جانب جو صاحب تشریف فرما تھے۔ان کی شکل انگریزی کے ہند سے سات سے ملتی جلتی ہے۔ان کا سوکھا چہرہ نہایت مسکین تھا۔اور اب تک وہ پیسٹری کی دو پلیٹیں صاف کر چکا تھے۔لیکن ہونٹ یوں بے حرکت اور خشک تھے گویا آٹھ پہر کا روزہ رکھ چھوڑا ہو۔ان کی ترکی ٹوپی کا پھندنا غائب تھا۔ان کی کلائی پر سبز حروف میں ان کا نام کھدا ہوا تھا۔

جنرل سیکرٹری کا خطاب جاری تھا۔ ان کی آواز ان کی گردن سے زیادہ موٹی اور بوجھل تھی۔ اور ہر پانچ دس جملوں کے بعد یہ جملہ اپنی تقریر میں ضرور لے آتے تھے۔ اور پھر قائداعظم مرحوم نے مجھے اپنی کوٹھی پر بلا کر فرمایا۔۔۔۔۔

پھر ہر بات کی تان کچھ اس قسم کے فقرے پر ٹوٹتی''

اس وقت اگر کوئی نہیں بک سکا تو وہ آپ کا خادم تھا۔

حاضرین سر ہلا کر صاحب تقریر کی ہر بات کی داد دے رہے تھے۔ اور پلیٹوں پر چسٹریاں اور ڈبوں میں سگریٹ تیزی سے ختم ہوتے جا رہے تھے۔

مجھے قائداعظم مرحوم نے اپنی کوٹھی پر بلایا' جس وقت میں بمبئی سٹیشن پر پہنچا آسمان پر دھواں دھار گھٹا چھا رہی تھی' ہوا پلیٹ فارم پر بلا ٹکٹ اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔۔۔۔

حاضرین جھوم جھوم گئے' میرے مسکین صورت ساتھی نے چسٹری کا گیارھواں ٹکڑا اپنے بے زبان منہ میں ڈال کر اسے جلدی سے نگلتے ہوئے کہا۔

سبحان اللہ۔ ہوا اٹھکیلیاں کر رہی تھی۔ واہ واہ''

حضرات' ہمیں سبز باغ دکھائے گئے ہیں۔

ایک طرف سے آواز آئی:۔

گول باغ کیسے۔

ہاں ہاں۔ آپ نے ٹھیک کہا گول باغ دکھائے گئے ہیں۔

جنرل سیکرٹری نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:۔

تو حضرات ہم نے اپنی جیب سے پورے تین سو روپے چندہ دیا پورے تین سو۔ کوئی دو تین چار نہیں۔''

ایک صاحب نے پلیٹ میں کباب گنتے ہوئے کہا۔

ایک دو تین۔ چار اس میں تو چار ہی رہ گئے بہرہ!''

''جی صاحب!''

''بھئی کباب اور لاؤ''

''بہت اچھا صاحب''

اور صاحب تقریر نے فرمایا:۔

حضرات میں کسی عہدے کا بھوکا نہیں ہوں جنرل سیکرٹری شپ تو میرے ساتھیوں نے یوں ہی مجھے سونپ دی ہے۔ میں نے مسجد میں حلف اٹھایا ہے۔ اور عہد کیا ہے۔ کہ جوں جوں ہماری جماعت میں آدمی آتے جائیں گے میں باہر نکل جاؤں گا۔''

ایک آواز:۔ آپ کہاں جائیں گے''

دوسری آواز:۔ پھر وہیں آ جائیں گے۔

محفل میں ہلکے ہلکے قہقہے بلند ہوئے۔

''سامعین میرا روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے۔ جو دانش مند ہیں اور وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر زمانے کی رفتار اور افتادِ طبع کو بخوبی جانچ سکتے ہیں۔ میں ان لوگوں سے مخاطب نہیں ہوں جو جاہ حشمت اور منصب کے بھوکے ہیں۔ جن کی آنکھیں زر و سیم کی چمک نے اندھی کر رکھی ہیں۔ اور جن کے متعلق ہی خداوند تعالے نے قرآن کریم میں فرمایا ہے کہ۔۔۔۔۔۔

اس کے بعد انہوں نے قرآن کی وہ آیت دہرائی جس کا اردو ترجمہ میرے مسکین ساتھی نے یوں کیا:۔

''ہم نے ان کی آنکھوں ان کے کانوں پر اور ان کے دلوں پر تالے ڈال رکھے ہیں'

پھر میرا ساتھی پنسل سے کان کھجلانے لگا۔ جیسے کسی پرانے زنگ آلود تالے میں چابی گھما رہا ہو۔

''حضرات ہماری جماعت کا مقصد اقتدار حاصل کرنا نہیں ہے۔ اقتدار حاصل ہونے کے

بعد ہم کوئی عہدے نہیں سنبھالیں گے۔''

ایک آواز:۔اور اقتدار کہاں سے آئے گا؟''

دوسری آواز:۔چیچو کی ملیاں سے''

لوگ ہنسنے لگے۔ ہوٹل کے بہرے بھی ہنسنے لگے اور۔ بی۔او۔اے' سی کی ایر ہوسٹس بھی ہنسنے لگی۔ جو اس سے پیشتر کئی پریس کانفرنس اسی طرح منعقد ہوتے دیکھ چکی تھی۔ جو اس وقت بھی مسکرا رہی تھی۔ اور اب بھی مسکرا رہی تھی۔ اور کل بھی مسکرا رہی ہوگی۔ اور سامنے دیوار پر سمندر کے کنارے کھڑی نیم عریاں دوشیزہ لوگوں کو سمندر کی طرف بلا رہی تھی۔

COME ON IN

آؤ سمندر میں نہائیں اور سمندر میں ڈوب مریں۔ لیکن سمندر بڑی دور تھا۔ اور پیسٹریوں کی تازہ پلیٹ بھی کافی دور تھی۔ چنانچہ مسکین صورت پیسٹری خود تیرھویں کریم رول کے خیال کو دل میں دفن کر کے اس کی قبر پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

اس کے بعد محفل منتشر ہوگئی۔ باہر مال پر شام کی مرطوب خنکی اپنے پر پھیلا رہی تھی۔ اور سبز برقی قمقمے روشن ہو گئے تھے۔ لوگ اپنی اپنی دھن میں یوں آ جا رہے تھے۔ جیسے انہیں کسی جماعت سے کوئی سروکار نہ ہو قریب ہی درختوں کے نیچے ایک کوچوان نے سگرٹ میں چرس بھرتے ہوئے لوگوں کے گروہ ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے دیکھے اور اپنے ساتھی سے کہنے لگا:۔

گاموں شاہ! بہت نئی پالٹیاں ہوتی ہیں آج کل۔

اگلے روز اتوار تھی۔

اور اتوار کو تیسرے پہر منٹو پارک میں عاشق راج پہلوان پٹھا بھاں پہلوان اور گوگا پہلوان پسر امام بخش پہلوان کے مابین دنگل ہوا۔ جس میں گوگا پہلوان نے عاشق پہلوان کو پانچ منٹ کی دلچسپ کشتی کے بعد چاروں شانے چت کر دیا۔

میں پورے دو بجے اپنے چند ایک دوستوں کے ساتھ وہاں آ پہنچا اس وقت اکھاڑے میں چھوٹی کشتیاں شروع تھیں۔ کنارے کنارے ڈھول پیٹنے والا چکر لگا رہا تھا۔ اور میاں ٹونڈی منصف اکھاڑے میں جھول جھول کر ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ اور کبھی اکھاڑے کی حدود سے باہر جانے والوں کو اندر لا رہے تھے۔ اور کبھی دیر سے مقابلہ کرنے والوں کو چھڑا رہے تھے۔ اکھاڑے میں تین کشتیاں بیک وقت لڑی جا رہی تھیں۔ جیتا ہوا پہلوان ایک ٹانگ پر اچھل اچھل کر ناچتا ہوا اپنے استاد کے پاؤں چھو کر اپنی ٹولی کی طرف بڑھتا جہاں اس کے گلے میں گلاب کے سرخ پھولوں کے ہار ڈالے جاتے وہ گلے میں ہار ڈالے سارے اکھاڑے کا چکر لگاتا۔ دونوں ہاتھ اٹھا اٹھا کر تماشائیوں اور ہمت بڑھانے والوں کا شکریہ ادا کرتا اور پھر واپس جا کر بادام کا شربت پینے لگتا۔ اکثر پہلوانوں کے بدن پر کیسر اور سندور ملا ہوا تھا۔ جس کی وجہ سے بعض ہلدی کی گانٹھ معلوم ہو رہے تھے۔ اور بعض بالکل ٹماٹر کی طرح سرخ تھے۔ اکھاڑے میں اترنے سے پہلے لاؤڈ سپیکر پر نئے پہلوان کی آمد کا اعلان کر دیا جاتا۔ وہ اکھاڑے کی حدود میں داخل ہو کر لنگوٹ اور پھر اوپر جانگیہ کستا۔ کرتہ اس احتیاط سے اتارتا کہ سر پر سے پگڑی نہ گرنے پائے (ان لوگوں کے بھی کچھ خواب ہوتے ہیں) پگڑی سر پر ہی رکھے بدن پر تیل کی ہلکی مالش کرتا ایک دو ڈنڈ لگاتا ادھر جب اس کا حریف میدان میں اترتا تو پھر وہ بھی پگڑی اتار کر اپنے استاد کو پکڑا دیتا اور علی حیدر کا نعرہ لگاتا ایک ٹانگ پر رقص کرتا ہوا اکھاڑے میں اتر آتا۔ دونوں پہلوان آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو جاتے اور دیکھتے دیکھتے کوئی نہ کوئی کٹے ہوئے درخت کی طرح زمین پر آ رہتا اور دوسرا اس کی چھاتی پر بیٹھ کر ایک نعرہ لگاتا اور پھر خوشی سے ڈھول کی تھاپ پر ناچتا ہوا واپس چلا جاتا۔

ڈھول والا امرت سر کا بڑا پرانا آدمی تھا۔ وہ ایک طویل عرصے سے دنگلوں میں ڈھول پیٹنے کا کام کرتا تھا۔ اور اسے پہلوانوں کی نفسیات سے واقفیت ہوگئی ہے۔ جب وہ دیکھتا کہ

پہلوان تھک گئے ہیں۔ اور ذرا ٹھنڈے پڑ گئے ہیں' تو وہ جھنجلا کر ڈھول پر ایسی تیز اور گھمک دار گت شروع کرتا کہ پہلوانوں کی رگوں میں خون گرم ہو جاتا اور ان میں ایک دم بجلی اسی لپک اور تیزی آ جاتی اور منٹوں میں کشتی کا فیصلہ ہو جاتا۔

پہلوان پسر امام بخش جب اکھاڑے میں اترا تو لوگوں نے تالیوں سے اس کا استقبال کیا۔ میرے ساتھی نے کہا:

'' یہ بڑا کام کرتا ہے۔ یہ ہر کشتی میں خطرہ مول لے کر لڑتا ہے۔ داؤ پر داؤ چلائے جاتا ہے'' خواہ خود ہی گر پڑے''

چنانچہ یہی ہوا۔ اس نے آتے ہی اپنے حریف کو ٹانگ سے پکڑنے کی کوشش کی' جب ناکام رہا تو پھر کلا جنگ'' کا داؤ چلایا' اور بدقسمتی سے خود آگے آ گیا۔ مگر فوراً اپنے آپ کو بچا کر سامنے لے آیا' پندرہ منٹ کی جدوجہد کے بعد کشتی برابر چھڑا دی گئی۔

لاؤڈ سپیکر پر عجیب عجیب سے اعلان ہوتے مثلاً ۔۔۔۔ صاحبان اب کیا ہونے والا ہے؟ ذرا بتائیے تو آخاہ ____ (پھر لمبی اور رونی سی جیسے بین کر رہا ہو) اب جوڑ آئے اوئے اب بڑا جوڑ آئے''

عاشق راج کے حواریوں نے اسے ریشمی جانگیہ پہنایا' اور ادھر گوگا پہلوان کو بھی دم کیا ہوا پانی پلایا گیا' اور الائچی دانے دیئے گئے' جو اس نے اکھاڑے میں آتے ہی اپنے حریف کے منہ پر دے مارے' کچھ لوگوں نے اسے محسوس بھی کیا لیکن کوئی زیادہ نہیں ا زیادہ محسوس کرنے والے لوگ عام طور پر اکھاڑے سے باہر ہوتے ہیں۔ یہ کشتی بڑی کانٹے دار تھی۔ اور ہمارے پاس ہی پہلوانوں میں پان پان سو روپے کی شرط بندھ گئی تھی چار منٹ تک کشتی بڑے نازک مقام پر گزرتی رہی اور لوگ دم بخود سے رہے' پانچویں منٹ گوگا پہلوان نے اپنا خاندانی داؤ چلاتے ہوئے عاشق راج کو دھم سے زمین پر گرا دیا اور اس کی چھاتی پر بیٹھ گیا' اور لوگ اٹھ کھڑے ہوئے' اور گرد' شور' ہنگامہ اور وہ سب کچھ جو کشتی سے

پہلے نہیں تھا۔

پچھلے دنوں لاہور میں زبردست بھونچال آیا۔ بھونچال لاہور کے در و دیوار ہلا کر چلا گیا' لیکن لوگوں کے دل ابھی تک ہل رہے تھے۔ اور یہ حالت تھی کہ بیٹھے بیٹھے ایکا ایکی کوئی پکار اٹھتا:۔

'' زلزلہ تھا ____ ہے نا؟''

اور دوسرا کچھ سوچے بغیر ہی اس کی تائید میں جھوٹ بول اٹھتا ہے۔

'' میں نے بھی محسوس کیا ہے''

زلزلہ کے بارے میں راقم الحروف کچھ لوگوں کے ردعمل پیش کرنا بھول گیا تھا مثلاً احمد ندیم قاسمی جس وقت زلزلہ آیا' اپنے گھر کی خواب گاہ میں تھے۔ ان کے پاس ایک شاعر کا مسودہ پڑا ہوا تھا' جس کا انہوں نے دیباچہ لکھنا تھا دوسرے کاموں سے فارغ ہو کر انہوں نے دیباچہ لکھنے کی غرض سے وہ مسودہ اٹھایا ہی تھا کہ ایک دم زلزلہ آ گیا۔ انہوں نے جھٹ سے مسودہ وہیں رکھ دیا اور اچک کر مکان کی کھڑکی میں آ گئے۔ ان کا بیان ہے کہ اس کے بعد سے وہ اسے ہاتھ لگاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ اور انہوں نے مسودہ بالکل نہیں چھیڑا ہے۔

لاہور کے غزل گو شاعر اس وقت اپنی خواب گاہ میں تھے۔ زلزلہ آیا تو وہ اپنی غزل کا مقطع کہہ رہے تھے۔ جھٹ سے کاغذ پھینکا اور میز کے نیچے گھس گئے۔ کسی نے پوچھا کہ صاحب میز کے نیچے گھسنے میں کیا نکتہ چھپا تھا۔ آپ نے فرمایا:۔

صاحب وہ جگہ نسبتاً محفوظ تھی' اگر مکان گرتا بھی تو پہلے اوپر کی چھت گرتی' پھر دوسری منزل کی چھت گرتی' اور پھر کہیں میز کی باری آتی''

ٹوکیو میں ایک بار زلزلہ آیا۔ جو سلسلہ وار جھٹکوں کی صورت میں تھا۔ اور دو ڈھائی منٹوں تک رہا۔ اس دوران میں شہر کے لوگ کافی ہراساں ہوئے گھروں سے نکل کر میدانوں میں جا

پہنچے ایک ہوٹل میں لوگ کیبنوں اور ہال کمرے سے بھاگ کر لان میں آ گئے' اور خوف زدہ ہو کر خدا سے دعائیں مانگنے لگے اتنے میں ایک صاحب غسل خانہ سے تولیہ کندھے پر لٹکائے باہر نکلے' اور لوگوں کو اپدیش دینے لگے:۔

''واہ صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں' بھلا مرد بھی اس طرح ڈرا کرتے ہیں۔ میری طرف دیکھئے۔ میں نے اپنے حواس نہیں کھوئے۔ میں آپ کی طرح نہیں گھبرا رہا۔

اور جب لوگوں نے ان کی طرف دیکھا تو انہیں معلوم ہوا کہ وہ صاحب اتنے حواس باختہ تھے کہ غسلخانے سے ننگے ہی باہر نکل آئے تھے۔

بھونچال کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ لاہور کے بعض علاقوں میں اس رات لوگوں نے اذانیں دی ہی تھیں' لیکن اس رات کسی مرغ نے اذان نہیں دی نہ جانے بے چارے مرغ گنگ ہو گئے تھے؟

لاہور میں اورنٹیل کالج السنۂ شرقیہ کا ایک مستند ادارہ ہے' یہاں نہ صرف یہ کہ تعلیم سستی ہے بلکہ معلم بڑے ادب دوست اور مشہور ناقدان نظم ونثر ہیں' اس کے باوجود نہ جانے کیا بات ہے کہ اس کالج میں ادب کی وہ فضا پیدا نہیں ہو سکی جو کسی ادب پرور ادارے کو زندہ رکھنے کے لئے بڑی ضروری ہوتی ہے۔ کالج کے لان میں پھول بھی ہیں۔ اور بڑ کا پرانا درخت بھی ہے۔ لیکن نہ تو ان پھولوں کو دیکھ کر کوئی خوش ہونے والا وہاں موجود ہے' اور نہ کسی کو بڑ کے درخت کی چھاؤں میں سے گذرتے ہوئے گیان کا دھیان آتا ہے۔

اور آئے بھی کیوں؟ دراصل یہ گیان دھیان کا زمانہ ہی نہیں ہے' اس دور میں تو صرف زبانیں سکھائی جاتی ہیں۔ اور ان زبانوں میں جو علم چھپا ہوتا ہے۔ وہ کسی کو نہیں سکھایا جاتا۔ اور پھر بات بھی یہی ہے' اگر کسی کس سکھائے سے علم حاصل ہوا کرتا تو ہر آدمی علم سیکھتا' دلچسپ بات یہ ہے کہ کالج کے برآمدوں میں جو پانی کے گھڑے رکھے ہیں' ان میں پانی

کی ایک بوند تک نہیں ہوتی پرسوں ایک طالب علم نے پانی پینے کے لئے آب خورہ اٹھایا' لیکن گھڑا خالی تھا۔ اس نے آب خورہ زمین پر پھینک دیا۔

گوئے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ
پہنچ کر چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

☆

زلزلہ کے بارے میں کچھ اور معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ لوہاری درواز کے اندر ایک مکان کسی پہلے زلزلے کے آنے سے ذرا ٹیڑھا ہو گیا تھا' جب یہ تازہ زلزلہ آیا تو لوگوں نے دیکھا کہ وہ مکان بالکل سیدھا ہو چکا تھا۔ ہوٹلوں میں شاعروں اور ادیبوں نے اس زلزلے کو بہت کم محسوس کیا۔

لاہور کے مشہور پرولتاری شاعر سے جب زلزلے کے بارے میں پوچھا گیا۔ تو آپ نے فرمایا:۔

اس وقت ضرور کسی مزدور کا دل دکھایا گیا ہے۔

ایک دوسرے صاحب ہیں۔ جو افلاطون کی خلیت پرستی اور کانٹ کے نظریہ جمالیات میں تطبیق پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جب آپ سے زلزلے کا رد عمل دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:۔

اور کچھ نہیں ہوا صرف خیالات متزلزل ہو گئے ہیں۔

☆

لاہور میں پچھلے دنوں مصر کٹ آرٹ کی ایک صوبائی نمائش ہوئی اس نمائش میں صوبے کے کونے کونے سے خیال پرست مصور اپنی اپنی تصویریں لئے ہوئے پہنچے۔ اس سلسلے میں ایک آرٹسٹ نے خیال کی جدت میں پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ یہ آرٹسٹ ایک خالی فریم لگائے بیٹھا تھا۔

پہلے روز ایک خاتون نے اس سے پوچھا۔

''اس تصویر میں کیا ہے؟''

مصور نے کہا:۔

''گائے گھاس چر رہی ہے''

خاتون نے چشمہ اتار کر بڑے غور سے فریم کو دیکھا اور جب اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا تو تعجب سے بولی۔

''لیکن یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے؟''

مصور بولا۔

گائے گھاس چر کر چلی گئی میڈم''

راوی کا میلہ

یہ پہلے پہر کے میلے کی بات ہے جو راوی کے کنارے لگتا ہے۔ اس روز اتنی بارش ہوئی کہ تھیٹریکل کمپنیوں کی تمام ہیروئنیں اپنے غرارے سنبھالتی خیموں سے باہر نکل آئیں اور بارہ دریوں میں قطار باندھ کر کھڑی ہو گئیں دوکانداروں نے مٹھائیوں کے تھال ان تختوں کے نیچے چھپا دیئے جن پر وہ بیٹھے ہوئے تھے اور خود بوریئے اوپر ڈال کر میلے کا لطف اٹھانے لگے۔ پہلے دن ان کی کلف لگی پگڑیوں کے طرے اکڑے ہوئے تھے اور وہ مونچھوں پر بار بار گھی کی مالش کر رہے تھے لیکن دوسرے روز پگڑیوں کے اکڑے ہوئے طروں کی بھی کمریں ٹوٹ گئیں اور مونچھوں کا گھی ٹھوڑیوں پر بہہ نکلا۔ تھوڑی دیر پہلے یہ لوگ اس گھی سے قلچے تل رہے تھے اور یہ گھی مونگ پھلی کے تیل اور مردہ سانڈ کی چربی سے تیار کیا گیا تھا۔ جس وقت ہم لوگوں کا قافلہ راوی پر پہنچا موسم بڑا خوش گوار تھا۔ اور میلہ بھر رہا تھا۔ ہمارا قافلہ دس بارہ دوستوں پر مشتمل تھا اور ہمارے ساتھ ایک خیمہ' ایک دری' ایک قالین' ایک ستار' ایک ڈھولک' سادا رتاش' شطرنج' کیرم فرائنگ پین برتن۔ سٹوو۔ دو چوری کی مرغیاں۔ سنسنی خیز رسالے۔ راتوں کی نیند حرام کر دینے والے ناول اور دن کا چین تباہ کرنے والا گراموفون بھی تھا۔ اس گراموفون کا ساؤنڈ بکس ریکارڈ پر چلتے چلتے اپنے آپ اچھلنے لگتا۔

چنانچہ ایک آدمی کی صرف یہی ڈیوٹی تھی کہ جب تک ریکارڈ چلے وہ ساؤنڈ بکس کو ہاتھ میں پکڑے رکھے۔

ہم نے ایک بڑی پر فضا جگہ پر خیمہ لگایا اور باہر گھاس پر سٹو و جلا کر چائے کا پانی گرم کرنے کے لیے رکھ دیا۔

خیمے میں دری بچھا کر قالین بچھا دیا گیا۔ اور کچھ دوست میلے کی سیر کو نکل پڑے دوکانیں دو طرفہ سجی ہوئی تھیں اور اس مرتبہ دوکاندار کافی مال تیار کر کے لائے تھے۔ ایک دوکاندار کی پیشانی پر لکھا تھا۔

کدھر جاتے ہو جناب من

آخر کدھر کو دھیان ہے

شیخ اللہ جوایا قصور کے مشہور میتھی فروش المعروف سائیں کی یہی دوکان ہے اس شعر کا دوسرا مصرع لمبائی میں شیخ اللہ جوایا قصور کے مشہور میتھی فروش المعروف سائیں بجلی کی ناک سے ملا جلتا تھا۔ شیخ صاحب گدی پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ اور گاہکوں کو گھور رہے تھے۔ ایک آدمی قریب سے گذرتا دیکھ کر آپ نے کہا۔۔۔

"باباجی قصور کی میتھی نہیں چاہیے؟"

اس آدمی نے ہاتھ جوڑ کر کہا:۔

"مگر باباجی میرا قصور۔۔۔؟"

ایک سنیاسی جنگلی جڑی بوٹیاں بیچ رہا تھا۔ اس نے سامنے ایک دیوار پر چرچل کی ایک تصویر لگا رکھی تھی۔ چرچل کے سر پر جناح کیپ تھی اور کمر میں تلوار لٹک رہی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

آیئے آیئے اور دیکھیے

ملک چین کے مشہور حکیم نے گھنٹیے کا مرض دریافت کیا۔ اس خاکسار کے پاس یہ توڑ موجود

ہے۔ ضرورت مند کو آزمائش شرط ہے۔ نیکی کر دریا میں ڈال۔ بے ایمان کا منہ کالا۔ اور سچے کا بول بالا۔

بقلم خود عاجز مسکین سید حکیم

فخر قوم گناہگار بخش دین خاں

(کالے شاہ کاکوی)

حکیم صاحب کا بول بالا تھا یا نہیں۔ اس کے متعلق مجھے علم نہیں مگر ان کے منہ کا رنگ ضرور کالا تھا۔

ہم لوگوں نے چرچل کی تصویر کے سامنے کھڑے ہو کر حکیم صاحب سے گھنٹیے کی دوا کا نمونہ اپنے کتے کو کھلایا اور وہ لنگڑا کر چلنے لگا۔

دیہاتی کسانوں کی ٹولیاں گاتی بجاتی گذر رہی تھیں۔ دوکانوں کے باہر لاؤڈ سپیکروں پر فلمی گانوں نے شور مچا رکھا تھا۔ لوگ کشتیوں پر دریا کی سیر کر رہے تھے۔ کنارے کنارے موتیے اور گلاب کے پھول لہروں کے بستر پر سو رہے تھے۔ میلہ کافی بھر گیا تھا اور کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ جب ہم اپنے خیموں میں پہنچے تو ہمارے کھوئے چھلے ہوئے تھے۔

اور چائے کا پانی ابل ابل کر خشک ہو گیا تھا۔

شام کو کھانا پکایا گیا۔

مرغیوں کو ذبح کرنے کا کام مجھے سونپا گیا۔

میں نے دونوں مرغیوں کو ذبح کرنے کے بعد تکبیر پڑھی مگر کسی کو نہ بتایا۔ چنانچہ حرام کر کے کھایا گیا۔

ویسے بھی دو ملاؤں میں ایک مرغی حرام ہوتی ہے۔

اس حساب سے چھ ملاؤں میں دو مرغیوں کا حرام ہونا لازم تھا۔

مرغ پکانے پر چھ آدمی مامور تھے۔

چنانچہ نمک، مرچ، گھی، مسالہ اور دوسری چیزیں چھ چھ مرتبہ ڈالی گئیں اور بھنا ہوا مرغ دسترخوان پر کئی مرتبہ دھو کر کھایا گیا۔

دس سیر گوشت میں سے پانچ سیر رات کو پکایا اور باقی پانچ سیر اس وقت پکایا گیا۔

جب ہم میں سے چار آدمی بھوک بھوک پکارتے رات کے تین بجے اٹھ کھڑے ہوئے۔ زردہ جب تیار ہو گیا تو خیال آیا کہ اس میں رنگ نہیں ڈالا گیا۔ چنانچہ رنگ بعد میں ڈالا گیا اور کھاتے وقت سب ہی کے ہونٹ زرد ہو گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ستار اور ڈھول پر ابھی محفل جمی ہی تھی کہ تیز ہوا کے ساتھ بارش شروع ہو گئی۔ جلدی جلدی باہر نکل کر بکھرا ہوا سامان اینٹوں کی طرح خیمے میں پھینک دیا گیا۔ اور ایک مشہور اخبار کے نامہ نگار نے ڈھولک بغل میں لٹکا کر اونٹ ناچ شروع کر دیا۔

اونٹ کی طرح۔

اس نامہ نگار کی بھی کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔

اور اگر یہ رقص زیادہ دیر تک جاری رہتا تو عین ممکن تھا کہ ہمارا خیمہ بھی اس صحرائی رقص سے متاثر ہو کر اونٹ ناچ شروع کر دیتا۔

بارش کا پانی اندر گھس آیا اور ہم نے جلدی جلدی قالین اٹھا کر کندھوں پر ڈال لیا اور دری اوپر کر لی۔

تھوڑی دیر بعد بارش رک گئی۔

پانی باہر نکالا گیا۔

دری اور قالین پھر سے بچھا دیا گیا۔ اور لیمپ کی روشنی میں سنسنی خیز رسالوں اور راتوں کی نیند حرام کر دینے والے ناولوں کا مطالعہ شروع ہو گیا۔

دوسرے دن صبح ابھی چائے تیار ہو رہی تھی کہ بارش پھر شروع ہو گئی۔ چینی کا ڈبہ دیکھتے دیکھتے پانی سے بھر گیا۔

اب خیمے کے اندر حلوہ تیار ہونے لگا۔

حلوے کی تیاری میں ہم سب مصروف تھے اور ہر آدمی گہری دلچسپی کا اظہار کر رہا تھا۔ چنانچہ جب وہ تیار ہوا تو پیالیوں میں ڈال کر پیا گیا۔ ہمارا ایک فلمی گیتوں کا عاشق ساتھی گراموفون کے پاس کان کھڑے کئے بیٹھا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اچھلتے ہوئے ساؤنڈ بکس پر تھا اور دوسرا ہاتھ گراموفون کے ڈھکنے پر جو بار بار نیچے گر پڑتا تھا۔ گراموفون میں سے ماسٹر نیاز کی ایک باریک آواز نکل رہی تھی۔

کتاب دیکھ چکی لیلے ذرا ادھر بھی دیکھ!

عید میلاد النبی کا دن لاہور میں بڑے اہتمام و احترام سے منایا گیا۔ یہ دن مسلمانان عالم کی تاریخ میں گرم و صحت مند دل کی طرح دھڑکتا ہے اور دھڑکتا رہے گا۔ اس ایک دن میں اسلام کی پوری تاریخ کا سنہری دور سمٹا ہوا ہے۔ یہی وہ دن ہے جب عرب کے ریگ زاروں میں ایک ایسے پھول نے آنکھیں کھولیں جس کی مہک دنیا کے کونے کونے میں پھیل گئی یہ ہی وہ دن ہے جو وہ مقدس پھول اپنی آسمانی خوشبو سے دنیا بھر کو مہکا کر ان ریگ زاروں میں سو گیا۔ یہ دن جادہ بھی ہے اور منزل بھی۔ یہ طلوع و غروب کا دن ہے۔

لیکن اسی روز طلوع ہو کر ڈوب جانے والا سورج غروب ہوا تو اپنے پیچھے تاریک دھندلکوں کی بجائے درخشاں اجالے چھوڑ گیا۔ یہ پہلا سورج تھا جو روشنیوں کے سیلاب میں غروب ہوا جو شام کے سایوں میں نہیں بلکہ صبح کے اجالوں میں ڈوبا۔

مسلمان دنیا کے کونے کونے میں اس دن کو خوشی اور غم کے ملے جلے احساس کے ساتھ مناتے ہیں۔ وہ اگر چمکیلی موم بتیاں روشن کرتے ہیں تو انہی موم بتیوں کے پاس پھولوں کے اداس چہرے بھی ہوتے ہیں۔ اس ایک دن میں سمٹا ہوا زندہ پیام کائنات کی بے کنار پہنائیوں میں پھیلا ہوا ہے اور اس دن کی حیات خیز دھڑکن انسانی زندگی کی ہمیشہ رہنمائی کرتی رہے گی۔ ہر مشکل مقام پر اسے راہ سجھائے گی۔ راوی کے شہر میں مقدس دن ہمیشہ بڑے احترام

سے منایا جاتا ہے جلسے ہوتے ہیں جس میں سرور کائناتؐ کے اسوہ حسنہ اور ان کی پرعزم پر جوش اور ہر اعتبار سے مثالی زندگی پر تقریریں کی جاتی ہیں۔
جلوس نکالے جاتے ہیں۔ گھروں اور مسجدوں میں میلاد مقدس کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ قرآن کریم کی تلاوت ہوتی ہے۔ غریبوں میں کھانا اور کپڑے تقسیم کیے جاتے ہیں۔
رات کو گھر گھر چراغ اور موم بتیاں روشن کی جاتی ہیں۔
اور اسی طرح ایک زندہ قوم کی طرف سے اس بات کا ثبوت دیا جاتا ہے کہ مومن ہر چیز سے روشنی اور زندگی کا سبق حاصل کرتا ہے اور اس کے لیے ہر غروب ہونے والا سورج طلوع ہونے والا آفتاب ہے۔

اس مرتبہ بھی حسب سابق لاہور میں جلسے ہوئے۔ جلوس نکالے گئے۔ میلاد شریف کی محفلیں منعقد ہوئیں اور رات کو روشنیاں کی گئیں۔ اس مقدس دن کو شایان شان طریقے سے منانے میں یوں تو سارے شہر نے شہر کے ایک ایک محلے اور محلے کے ایک ایک کونے کے ہر گھر نے حصہ لیا۔
لیکن جن علاقوں میں اس تقریب سعید پر خصوصیت سے اہتمام کیا گیا۔ ان میں موچی گیٹ اور گوالمنڈی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

صبح سات بجے میں نے مصری شاہ اور فاروق گنج کے ہائی سکول کے بچوں اور رضا کاروں کو گول باغ (جلسہ گاہ) میں جانے کی تیاریوں میں مصروف دیکھا۔
آٹھ بجے میں گوالمنڈی میں تھا۔ جہاں چوک کو پھولوں' جھنڈیوں۔ رنگین غباروں اور رنگ برنگ کے برقی قمقموں اور کیلے کے درختوں اور یوکلپٹس کی ٹہنیوں کے دروازوں سے سجایا جا رہا تھا۔

نو بجے میں نیلا گنبد سے گذرنے والے رضا کاروں کے ایک جلوس میں شامل ہو کر پورے سوا نو بجے جلسہ گاہ (گول باغ) میں پہنچ گیا۔ جہاں گورنر پنجاب نے قوم کو خطاب کرنا تھا۔
میں نے دور سے وہ چھوٹا سا خوب صورت راستہ دیکھا۔ جہاں سے اخباروں کے نمائندے گذر کر آرام دہ کرسیوں کی گود میں جا بیٹھے تھے لیکن میں اس طرف نہ گیا۔ اس لیے کہ میں اخبار کا نمائندہ نہیں تھا بلکہ لاہور شہر کا نمائندہ تھا۔ اور اس شہر میں رہنے والے لوگوں کا نمائندہ تھا۔ میں جلوس کے ساتھ لوئر مال کی جانب سے جلسہ گاہ میں داخل ہوا۔ اس وقت سٹیج پر نعت خوانی ہو رہی تھی۔ اور لوگ ہجوم در ہجوم گول باغ کی طرف بڑھتے چلے آرہے تھے۔ جلسہ شروع ہوا اور وہاں خاموشی چھا گئی۔ لوگوں نے پوری دل جمعی کے ساتھ اکابرین ملت کی تقاریر کو سنا۔ باغ میں ادھر ادھر کی پان سگریٹ' مولیاں' چلغوزے بیچنے والے اور جماعت اسلامی کے بلے لگانے والے گھوم پھر رہے تھے۔ ان بلوں پر وہی ان کا پرانا مطالبہ اسلامی دستور لکھا ہوا تھا۔
ایک آدمی کو جب زبردستی بلا لگایا جانے لگا۔ تو وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔
''حضور پہلے ہی آٹا مہنگا ہے''

تہواروں کا شہر

لاہور میلے اور تہوار منانے والوں کا شہر ہے۔ یہاں ہر پہلا آدمی کچھ نہ کچھ مناتا ہے۔اور ہر دوسرا آدمی پہلے آدمی کو نہیں مانتا۔ کسی کو نہیں مانتا۔اس مرتبہ عیدالضحی کا مقدس تہوار بھی حسب سابق بڑے اہتمام سے منایا گیا۔سورج نکلتے ہی بڑے 'بوڑھے اور جوان اور زرق برق لباس میں ملبوس بچے عیدگاہوں کی جانب جانا شروع ہو گئے تھے۔سڑکوں۔ بازاروں اور گلیوں میں ریشمی عید نے اپنا گوٹا لگا آنچل پھیلا دیا تھا۔اور ذہنی خوشی کی چہکاروں میں مسکین بکروں اور دنبوں کی صدائے شیون دب کر رہ گئی تھی۔کئی روز پہلے ہی سے لوگوں نے اپنے اپنے دنبوں کا بناؤ سنگار شروع کر دیا تھا۔کس پر مہندی سے 'پاکستان زندہ باد' لکھا ہوا تھا۔کسی پر عید مبارک لکھا تھا۔کسی پر دنبے کے مالک کا نام درج تھا۔ایک دنبے پر جانے کیوں یہ لاہور ہے۔لکھا تھا۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ عید پر اخبارات اور رسالہ جات کی طرف سے بھی قربانی کا خاص انتظام ہونا چاہیے اور ہر دنبے پر مہندی سے خاص عبارت لکھنی چاہیے۔

مثلاً روزنامہ ''نوائے وقت'' پر

تیرے کوچے میں ارمانوں کی دنیا لے کر آیا ہوں'' لکھا ہو۔

جو دنبہ روزنامہ ''امروز'' کی طرف سے ذبح ہو اس پر لکھا ہو۔

''سندھ باد جہازی کا آخری سفر'' ۔

روزنامہ ''سول ملٹری'' کے دنبے پر جلی حروف میں یہ مصرع درج ہو۔

''شہنشاہ سلامت رہے یاالٰہی''

روزنامہ ''شہباز'' پر لکھا ہو'

''ساتواں ایڈیٹر''

روزنامہ ''احسان'' پر صرف

''روزنامہ احسان ہی کافی ہوگا''

پاکستان ٹائمز کے دنبے پر فیض کا یہ مصرع لکھا ہو۔

''اب یہاں کوئی نہیں آئے گا''

مغربی پاکستان کے دنبے پر سبز حروف میں لکھا ہو۔

''پاکستان آرٹ کونسل زندہ باد'

فلمی ہفتہ وار اداکار کا بکرا بار بار حمیار رہا ہوتا اور اس پر'' قمر اجنالوی'' کا نام لکھا ہوتا۔

ریڈیو پاکستان کی جانب سے ایک خاص عربی اونٹ ذبح کیا جاتا۔جس پر لکھا ہوتا:۔

''ہمارا موسیقی کا پروگرام ختم ہوا''

اس کے علاوہ لاہور کے مختلف ادبی اور سیاسی اداروں کو بھی قربانی کا احساس ہونا چاہیے۔ان اداروں میں حلقہ ارباب ذوق' حلقہ ارباب علم' انجمن ترقی پسند مصنفین اور جناح عوامی لیگ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

حلقہ ارباب ذوق کی جانب سے قربانی کے لئے ایک دبلے پتلے بکرے کا انتظام ہونا چاہیے۔جس پر پتلے دبلے لفظوں میں ''میرا جی کے کچھ گیت لکھے ہوتے۔'' حلقہ ارباب علم کے بکرے پر'' علم و ادب'' درج ہوتا اور انجمن ترقی پسند کے مصنفین کے دنبے پر'' امرت

سرسکول آف تھاٹ'' لکھا ہوتا۔ جناح عوامی لیگ کا بکرا نہ ہوتا بلکہ اس بکرے کی ماں ہوتی اور اس پر لکھا ہوتا۔

تو کب تک خیر منائے گی۔''

جماعت اسلامی کے دنبے پر مومن کا شعر ذرا سے تصرف کے بعد درج ہوتا

تو کہاں جائے گا اپنا کچھ ٹھکانا کرلے
ہم تو کل خواب عدم میں پیارے ہوں گے

عید بذات خود ایک عیدی ہے۔ جو قدرت کی طرف سے اپنے بندوں کو ہر سال ملتی ہے۔ عید کے دن لاہور میں صبح سے شام اور شام سے رات گئے تک اچھی خاصی چہل پہل رہی۔ نماز کے وقت بادشاہی مسجد میں وہ ہجوم مومناں تھا کہ شکوہ ملک و دیں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نماز کے رنگ برنگ ملبوسات اور خوشبویات کا سیل رواں تھا کہ شہر کے مختلف حصوں کی جانب بہہ نکلا۔ گلیوں میں قصابوں کو سر کھجلانے کی بھی فرصت نہ تھی۔ بے زبان بکرے اداس و ویران نگاہوں سے کبھی زرق برق کپڑوں والی بچیوں کو تک رہے تھے اور کبھی سل پر چھری تیز کرتے ہوئے قصائی کو ابھی چھری تیز ہو جائے گی اور اس کے گلے پر ایک دم پھرے گی اور زرق برق والی بچیوں کے پیارے چہرے دھندلا جائیں گے۔ اسے ہر گھر کی بلائیں لینے والے بے زبان! تیری بلائیں کون لے؟ شام ہوتے ہی سڑکوں پر برقی قمقموں کی لڑیاں جگمگا اٹھیں۔ گرمی کا زور کم ہو چکا تھا۔ چنانچہ خوش باش لوگوں کی ٹولیاں بازاروں میں گشت کرنے لگیں۔

لارنس باغ کی طرف سے رات کی رانی کی مہک آنے لگی اور ریگل کے چوک میں فٹ پاتھ پر ایک مریض بھکارن اپنے دامن میں گرے ہوئے پیسے گننے لگی۔

ایک' دو' تین' چار' پانچ--------

''اے فٹ پاتھ کی رانی!

آج تو پانچ پیسے ہوئے ہیں۔ آج تو بڑی مال دار ہے۔ آج تو تجھے قتلمہ اور سوہن حلوہ کھانا چاہیے اور اپنے ان بچوں کے لیے رنگین غبارے خریدنے چاہئیں۔ جنھوں نے سڑک غبار میں جنم لیا ہے۔ اور وہ ساری عمر رنگین غباروں کے پیچھے بھاگتے رہیں۔ تجھے عید پر کسی بکرے کی ضرورت نہیں تو وہ بکری ہے جسے اس سڑک کے فٹ پاتھ نے جنا ہے اور جو ہر روز تجھے قربان کرتا ہے۔

''تو واقعی فٹ پاتھ کی رانی ہی ہے۔''

عید کا تہوار لاہور میں بڑے اہتمام سے منایا جاتا ہے۔ ایک ماہ کے کڑے امتحان سے گذرنے کے بعد عید کا دن نتیجہ نکلنے کا دن ہوتا ہے۔ اور اس دن کوئی فیل نہیں ہوتا۔ روزہ داروں کے ساتھ وہ لوگ بھی پاس ہو جاتے ہیں جو روزہ نہیں رکھتے۔ اپنی نوعیت کا یہ پہلا امتحان ہے جس میں ایسے طلبہ بھی پاس ہو جاتے ہیں جو پڑھا نہیں کرتے۔ ویسے بھی لاہور زندہ لوگوں کا شہر ہے یہاں مختلف علاقوں میں مختلف انداز سے عید منائی جاتی ہے۔ مال روڈ کے لوگ دوکانیں بند کر کے اور گوالمنڈی کے لوگ دوکانیں کھول کر عید مناتے ہیں۔

اس عید پر بھی موچی' دلی اور گوالمنڈی میں رات کے ڈیڑھ دو بجے تک رونق رہی اور ہوٹلوں میں گاہکوں کا تانتا بندھا رہا تھا۔ مال کے ہوٹلوں میں گاہکوں کا تانتا خلاف معمول کھلا ہوا تھا اور کہیں کہیں صرف ادھار کھانے والے بڑی گرم جوشی سے مرغ اور مغز کھا رہے تھے۔ گوالمنڈی رونق اور چہل پہل کے اعتبار سے لاہور کے بیشتر علاقوں سے بازی لے گیا ہے۔ اس چوک میں امرتسر کے مختلف محلے پورے کے پورے آباد ہیں۔ یہاں کے ہوٹلوں میں 'شیراز ہوٹل' کافی مشہور ہے۔ اور میں نے اکثر عیسائی عورتوں کو بھی کیبن میں بیٹھ کر بریانی اور مرغ وغیرہ کھاتے دیکھا۔ عید کے روز چار بجے تک اس ہوٹل میں تھا۔ اس ہوٹل میں 'مکیش' لتا اور رفیع کے ریکارڈ بجتے رہے اور یوں اس ہوٹل نے نیا ریکارڈ قائم کیا۔ میں بھی اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ شیراز ہوٹل میں رات کے گیارہ بجے تک کے ریکارڈ سنتا

رہا۔اور کولات اور مشروبات سے اپنے جگر کی آگ ٹھنڈی کرتا رہا۔رمضان کے دنوں میں اس ہوٹل میں نعت قوالیوں کے ریکارڈ بجایا کرتے تھے۔اور یہیں سے لوگ ٹولیاں بنا بنا کر گلی گلی گا کر روزہ داروں اور غیر روزہ داروں کو جگایا کرتے تھے۔ایک رات ایک ٹولی نے فلم "البیلا" کا یہ گانا گا کر لوگوں کو بیدار کر دیا۔

دھیرے سے آجا ری اکھین میں

نندیا آجا ری آجا____

اور روزہ داروں کی اکھین سے نندیا بڑے دھیرے سے کھسک کر چلی گئی۔اور دہلی دروازے کے باغ میں عید سے کئی روز پہلے ہی موت کا کنواں کھودا جا رہا تھا۔پنگوڑے نصب کیے جا رہے تھے اور حلوائیوں نے بھٹیاں بنانا شروع کر دی تھیں۔عید کے دن صبح ہی سے میلہ لگ گیا۔پنگوڑے چلنے لگے اور بچے بچیوں کے گوٹہ لگے ریشمی آنچل اور کالے کالے بال ہوا میں لہرانے لگے۔چوڑیاں بیچنے والوں کے پاس لڑکیوں کے ٹھٹھ لگ گئے۔حلوائی جلدی جلدی پوڑیاں اور قتلمے تلنے لگے۔وہ لوگوں کی نظریں بچا کے ہر آدھ گھنٹہ بعد خالص بناسپتی گھی کا ڈبہ انڈیل لیتے اور بھٹی میں آگ تیز کر دیتے۔موت کے کنوئیں والے لاؤڈ سپیکر پر چیخ چیخ کر پکار رہے تھے۔

"پاکستان کا مایہ ناز مجاہد۔مسٹر اللہ رکھا بورے والا موت کے کنوئیں میں چھلانگ لگاتا ہے۔صرف ایک آنہ میں۔

"پاکستان کا مایہ ناز مجاہد صرف ایک آنہ میں۔"

دوسری طرف ٹاہلی کے درخت پر پینگ چڑھی ہوئی تھی۔دو کم سن لڑکیاں آمنے سامنے بیٹھی تھیں اور پینگ والا ایک لڑکی کے پاؤں پکڑ کر زور سے جھٹکا دیتا اور پینگ اوپر اٹھ جاتی۔وہ لڑکی بار بار چیخ رہی تھی۔

"ہائے میرے پاؤں چھوڑ دو۔میرے پاؤں نہ پکڑو۔میں گر پڑوں گی۔۔۔میں گر پڑوں

گی۔"

مگر آدمی کو اس سے کوئی غرض نہ تھی۔وہ ہر بار پینگ آہستہ ہوتے دیکھ کر لڑکی کے پاؤں پکڑ کر زور سے جھٹکا دیتا' اور ساتھ ہی آواز لگاتا:۔

"چلو بہشت کے نظارے صرف ایک آنہ میں____

آج کل صرف ایک آنہ میں بہت کچھ ہو جاتا ہے۔بہشت کے نظارے بھی ملتے ہیں اور موت کا کنواں بھی۔پاس ہی ایک درخت تلے ایک پہلوان خربوزوں کا ڈھیر لگائے بیٹھا ہے اور بار بار چیخ رہا ہے:۔

"چلو بھراؤ عید مبارخ۔۔۔خربوزے کھاؤ تے ڈھول وجاؤ بچ منڈیا موڑ توں۔۔میں صدقے تیری ٹور توں۔۔۔تے عید مبارخ........"

مصری شاہ کا نام کسی ایسے شخص نے تجویز کیا ہے جس نے نہ تو مصر دیکھا ہوگا اور نہ مصری کھائی ہوگی کیونکہ اس محلے میں آپ کو کہیں بھی کوئی ایسا منظر دکھائی نہ دے گا جس میں ایرانی قالینوں پر زہرہ جمال رقاصائیں دفین بجا بجا کر گا رہی ہوں۔ایسے کھبے ہر جگہ ملیں گے جن کو دیکھ کر لگے گا جیسے مالش کرنے والے گاہکوں کے سروں پر طبلہ بجا بجا کر ان کی مالش کر رہے ہوں گے۔یہاں ایک گلی کا نام طہران سٹریٹ ہے۔میرا خیال ہے کہ اگر یہ گلی کسی ایسے شخص کو دکھائی جائے جو طہران جانے کے لیے بالکل تیار ہو تو وہ گھر آ کر سب سے پہلے کام یہ کرے گا کہ پاسپورٹ پھاڑ کر حافظ اور مصری دیوانوں کے ساتھ چولہے میں جھونک دے گا اور کسی درخت کے نیچے لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائے گا اور باقی عمر یاد الٰہی اور دنیا کی بے ثباتی پر غور کرنے میں ہی بسر کر دے گا۔

لیکن عید کے دن اس گلی میں بھی طہران کے بازاروں ایسی چہل پہل تھی کم سن لڑکیاں صاف ستھرے دھلے ہوئے کپڑے پہن کر سوئیوں کی تھالیوں سمیت عزیز و اقارب کے ہاں جا رہی تھیں۔طہران سٹریٹ کے ساتھ ہی گھرگ سٹریٹ واقع ہے۔آج کل اس کا یہ عالم

ہے کہ اگر دو پہر کو آپ اس گلی میں سے گذرنا چاہیں تو یہ ہوگا کہ آپ ایک جاندار کی حیثیت سے گلی میں داخل ہوں گے اور کباب بن کر گلی کے دوسرے سرے پر گر پڑیں گے۔ اس گلی کا نام صرف مرگ سٹریٹ ہونا چاہیے تھا۔ مرگ سٹریٹ جوانا مرگ سٹریٹ! گل کے ساتھ ہی اس گلی کا اس پورے محلے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں کوئی گل مرگ نہیں کوئی گل سون نہیں۔ ہاں جو یہاں سے گذرتا ہے وہ گل ضرور ہو جاتا ہے۔

مال بین الاقوامی سڑک ہے اور پورے لاہور کی مال سردیوں میں ٹھنڈی اور گرمیوں میں گرم ہوتی ہے۔ اس سڑک پر آپ کو ہر قسم اور ہر طرز اور نوع کے لوگ ملیں گے زمرے کی توپ سے چل کر آپ چیرنگ کی اس بارہ دری تک چلیں جائیں۔ آپ کو آدمی کم اور لباس زیادہ ملیں گے۔ یہاں ہر ایک آدمی لباس پہنتا ہے اور محض اس لئے اکڑ اکڑ کر چلتا ہے کہ اس کا لباس پر شکن نہ ہو جائے۔ یہاں میں نے ایسے جواں مردوں کو بھی دیکھا ہے جو بنیان اور چلون پیڈ لگوا کر پہنتے ہیں اور کافی کی دس دس پیالیاں پلک جھپکنے میں پی جاتے ہیں۔ عید کے دن اگر چہ مال روڈ پر کوئی رونق نہ تھی لیکن شام ہوتے ہی امریکی ٹائپ نوجوانوں کی ٹولیاں سیٹیاں بجاتی نکل کھڑی ہوئیں تھیں۔ آج کل مال پر ایسی امریکی بش شرٹوں کا رواج بڑا عام ہو رہا ہے۔ جس پر نیو یارک کے سکائی سکیرز اور بڑی بڑی عمارتوں کی تصویریں کھچی ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے اس رواج کو فروغ دینا چاہیے۔ اس سلسلے میں لاہور کے ادیبوں اور شاعروں کو سب سے پہلے حصہ لینا چاہیے۔ مثلاً احمد ندیم قاسمی اپنی بش شرٹ پر 'بگولے' اور 'جلال و جمال' کے سرورق چھپوالیں۔ منٹو صاحب گذریں تو ان کی بش شرٹ پر لذت تنگ' خالی بوتلیں' خالی ڈبے' اور گنجے فرشتے کا رنگین سرورق دور سے دعوت نظارہ دے رہا ہو جو فن کار صاحب کتاب نہیں ہیں وہ اپنا تازہ کلام استعمال میں لائیں۔ ناصر کاظمی اپنی پسندیدہ غزلیں ہی بش شرٹ پر لکھوالے اور اعجاز احمد بٹالوی اپنا کوئی تازہ افسانہ-----!

ٹرو کی شام لارنس باغ کے اوپن ائیر کیفے میں پاکستان ہیلتھ کلب کے کارپردازان ملک اسلم

حیات اور میر اقبال کی جانب سے لاہور کے ادباء اور شعراء اور دیگر ممبران کو ڈنر دیا گیا۔ ادباء اور شعراء میں سے ہر مکتبہ فکر کے لوگ موجود تھے۔ ان میں احمد ندیم قاسمی' قتیل شفائی' ظہیر کاشمیری۔ قیوم نظر۔ شہرت نجاری۔ عارف عبدالمتین۔ بقا نقوی اور ناصر کاظمی وغیرہ بھی شامل تھے۔ ترقی پسند گروپ ہٹ کر ایک طرف بیٹھا تھا اور حلقہ ارباب ذوق گروپ اسٹیج کے پاس کرسیوں پر براجمان تھا۔ ترقی پسندوں میں قاسم صاحب کو نکال کر باقی ساری منڈلی ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو ترقی کو پسند کرتے ہیں جو مال اور میکلوڈ کے ہوٹلوں میں بیٹھ کر عوام کے غم میں چائے پیتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں۔ جو سنتے کم اور بولتے زیادہ ہیں جو پڑھتے کم اور لکھتے زیادہ ہیں۔ ان میں ایسے شعراء کرام بھی ہیں جو اپنے آپ کو پاکستان کا سب سے بڑا شاعر سمجھتے ہیں۔ جو انسانی حقوق کے تحفظ پر لمبی لمبی نظمیں لکھتے ہیں اور چپکے سے کسی دوست کی ضرورت سے فائدہ اٹھا کر اس کا مسودہ سو روپے پر خرید کر دو سو روپے پر آگے فروخت کر دیتے ہیں۔ یہ بہت بڑے دوست ہیں۔ بہت بڑے شاعر ہیں۔ بہت بڑے انسان ہیں۔ چین سے بھی زیادہ بڑے صحرائے گوبی سے بھی زیادہ بڑے!

دعوت شروع ہوئی تو برتن ختم ہو گئے' میزوں کی ایک قطار پر کھانا لگ گیا اور دوسری قطار کے لوگ منہ دیکھنے لگے۔ پہلے ایک دوسرے کا اور بعد میں کھانے والوں کا۔ قیوم نظر کے آگے پلاؤ کا ٹرے پڑا تھا۔ مگر پلیٹیں غائب تھیں۔ ناچار اس نے نان اٹھایا اور اس پر چاول ڈال کر کھانے لگا۔

کشمیر زندہ باد!۔ جب پلیٹیں آئیں تو پلاؤ ختم ہو چکا تھا۔ وہاں سے پلیٹیں اٹھا کر دوسری طرف رکھی گئیں۔ پہلی قطار کے بعد دوسری قطار نے کھانا شروع کیا اور تیسری قطار ان کا منہ دیکھنے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ ان پلیٹوں کو دیکھنے لگی جو پلاؤ سے لبریز تھیں۔ پارٹی کے لوگ اوپن ائیر ہوٹل کے لان کے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ چنانچہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے گاہک بڑی آسانی سے

پارٹی کا ماحضر تناول فرما رہے تھے اور ملک کی جان و مال کو دعائیں دے رہے تھے۔ کچھ لوگ سڑک سے اتر کر پارٹی میں آئے۔ میز پر سے بڑی پلیٹ اٹھائی اور جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھ کر بسم اللہ کر کے کھانا شروع کیا۔ دعوت کے اختتام پر مائیکروفون پر اعلان کیا گیا۔

'' آپ اب اپنی اپنی کرسیاں پیچھے کھسکا لیجئے اور شعراء کے کلام سے لطف اندوز ہوں۔

لوگوں نے کرسیاں پیچھے کھسکا لیں اور ترقی پسند شعراء کرسیوں کے ساتھ خود بھی کھسک گئے (ترقی پسند ہمیشہ کھسک جاتے ہیں۔ ڈر ہے کہیں وہ انقلاب برپا کر کے بھی نہ کھسک جائیں) اب جو نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو دور دور تک ترقی پسند شعراء کا نشان نہیں مل رہا۔ ہاں صرف کرسیوں کے پاس گری پڑی ہڈیاں اس بات کی طرف اشارہ کرتی تھی کہ ابھی ابھی یہاں سے کچھ لوگ سالم مرغ ہضم کر کے اٹھے ہیں۔ دراصل مرغ کھا کر شعر سنانا بڑا مشکل ہے۔ مرغ کھا کر آدمی ملک اقتصادی بدحالی پر بحث کر سکتا ہے۔ شعر نہیں سنا سکتا۔ چنانچہ بعد میں ناصر، قیوم نظر اور دوسرے شعراء قابو آ گئے۔ قیوم نظر نے ''عشق گریزاں'' سنائی اور ناصر کاظمی نے اپنی ایک غزل

ساز ہستی کی صدا غور سے سن

سنائی۔ اس غزل کو پچھلی قطار کے لوگوں نے غور سے سنا اور تالیوں کی بجائے سر پیٹے۔ اگلی قطار کے لوگوں نے منہ کھول کر داد دی۔ کہیں پیچھے سے کسی نے فقرہ چست کیا۔

چھوڑ کے دنیائے بے رنگ ناصر
کالے پانی کی سزا غور سے سن

شام کو میں نے دیکھا کہ کافی ہاؤس میں کچھ ترقی پسند حضرات ہیلتھ کلب کی دعوت کی مرغیوں کی تعریف کر رہے تھے اور ایک اور پارٹی سے ''کرسیاں پیچھے کھسکانے'' کا پروگرام بنا رہے تھے۔

اس عنوان کے تحت میں آپ کو لاہور کی ان ادبی اور سیاسی تقریبوں کا حال سناؤں گا جن میں مجھے شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ صرف تفریح حاصل کرنے کی خاطر میں نے اپنے طور پر بعض باتوں میں مزاح کا رنگ بھرنے کی کوشش کی ہے ورنہ یہ تقریبات اتنی مزاحیہ اور غیر سنجیدہ نہ تھیں۔ سب سے پہلے بزم ادب کے ایک اجلاس کی کاروائی سنیے:۔

بزم ادب کا اجلاس ٹھیک گیارہ بجے ایک چھوٹے سے گول کمرے میں شروع ہوا۔ اس کمرے کی دیواروں پر ملایا اور سیلون کی بڑی بڑی رنگ دار تصویریں چسپاں تھیں۔ سب سے پہلے ایک صاحب نے غزل پڑھ کر سنائی۔ ایک اور صاحب نے کسی مصرعے پر اعتراض کرتے ہوئے کہا:۔

''صاحب صدر اس مصرعے کے پہلے لفظ میں نون کا اعلان ہوتا ہے۔''

ایک آواز:۔ ''تو پھر کس کا اعلان ہونا چاہیئے؟''

صدر صاحب:۔ ''خاموش! خاموش!''

سیکرٹری صاحب شروع سے آخر تک منہ میں کچھ دبائے چباتے رہے غزل کی ردیف تھی 'شباب نہیں' ارباب نہیں' اس پر سیکرٹری صاحب کے چبانے سے ایک شعر اس طرح مداح

نے بھی کہہ دیا۔

خدا کے واسطے ظالم چبا چبا کے نہ کھا
یہ چانپ ہے میرے دل کی کوئی کباب نہیں !

لیکن ظالم سیکرٹری بدستور چباتے رہے اور چباتے چلے گئے۔ جن صاحب کا افسانہ تھا وہ کسی وجہ سے شریک مجلس نہ ہو سکے تھے۔ اس لئے ایک اور صاحب نے افسانہ پڑھا۔ افسانہ ختم ہوا تو صاحب صدر نے تنقید کی دعوت دی۔ تنقید کی یہ دعوت کسی نے قبول نہ کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب لوگ گھر سے کھاپی کر آئے تھے لیکن ایک صاحب سے نہ رہا گیا۔ آپ نے ٹوپی ذرا آگے کھسکاتے ہوئے فرمایا:۔

''جناب صدر! افسانہ میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا''

صاحب صدر:۔''تو پھر اسے پاس کر دیں؟''

حاضرین:۔''جی ہاں! ضرور ضرور!''

چنانچہ ایک عجیب وغریب اتفاق سے افسانہ بالاتفاق رائے پاس کر دیا گیا۔ حسن اتفاق سے جن کا افسانہ رکھا گیا تھا وہ بھی تشریف لے آئے۔ پہلے تو انہوں نے بڑا احتجاج کیا اور اس کے بعد زبردستی اپنا افسانہ پڑھنا شروع کر دیا مجبوراً لوگوں کو سننا پڑا۔ جب تنقید شروع ہوئی تو ایک عینک پوش صاحب بولے:۔

''اس افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں چلتے پھرتے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔''

دوسری آواز:۔''معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ چلتے پھرتے لکھا گیا ہے۔''

اس کے بعد خاموش سیالکوٹی کوئی شاعر ہیں۔ جنہوں نے نہایت خاموشی سے اپنی نظم پڑھی اور لوگ منہ کھولے کان بند کئے بغیر خاموشی سے سنتے رہے۔ بعد ازاں سیکرٹری صاحب نے

چباتے ہوئے اٹھ کر جلسہ برخاست ہونے کا اعلان کر دیا اور صاحب صدر ان کا منہ ہی تکتے رہ گئے۔

سورج بڑی خوبصورتی سے چمک رہا تھا۔ اوراورنٹیل کالج میں بزم احباب کی ہفتہ وار ادبی نشست ہو رہی تھی۔ پروگرام کے مطابق ایک صاحب کو مقالہ ''قومی زبان'' پڑھنا تھا۔ حسن اتفاق سے انہوں نے اپنا مقالہ نہیں لکھا تھا لیکن وہ اپنے ساتھ وہ کاپی لیتے آئے تھے جس میں مقالے کے نوٹس لے رکھے تھے چنانچہ آپ نے وہی نوٹس پڑھ کر سنا دیئے انہوں نے عربی۔ فارسی۔ ہندی اور جاپانی کے امتزاج سے جو نئی نئی ترکیبیں وضع کی تھیں وہ واقعی قابل داد تھیں۔ مثلاً رنگ ہو (ایک خالص رنگ) وغیرہ وغیرہ۔

اپنے مقالے میں انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اردو ہماری قومی زبان بننے کا درجہ رکھتی ہے۔ اس پر بھی حضرات متفق تھے۔ اس اتفاق کے باوجود مقالے پر کافی بحث ہوئی۔ بحث کرنے کا انداز بڑا دلچسپ تھا اور صاحب صدر سے مخاطب ہوئے بغیر انہیں درمیان میں لائے بغیر لوگ ایک دوسرے سے بحث کر رہے تھے۔ ویسے بھی صاحب صدر درمیان میں نہیں تھے بلکہ کافی پرے ہٹ کر بیٹھے پاکستان ٹائمز پڑھ رہے تھے۔ ایک صاحب نے انکشاف کیا کہ بنگالی رسم الخط دراصل عربی رسم الخط ہے۔ اس پر کچھ حضرات 'جز بز' ہوئے۔ اتنے میں تین عربی کے طلبا کمرے میں تشریف لائے۔ ان کی وضع قطع کچھ ایسی تھی کہ وہ بالکل عربی رسم الخط معلوم ہو رہے تھے۔ یہ تینوں عربی رسم الخط سب سے پچھلے بنچ پر جا کر بیٹھ گئے۔

صاحب مقالہ بڑی تیزی اور زور شور سے بول رہے تھے۔ بالکل یوں لگ رہا تھا جیسے سڑک کوٹنے والا انجن پتھروں پر سے گذر رہا ہو۔ ایک صاحب نے اعتراض کرتے ہوئے فرمایا:۔

''صاحب مقالہ بہت سرپٹ بولتے ہیں''

صاحب مقالہ گھبرا سے گئے، صاحب صدر نے تائید فرمایا۔

''ہاں بھئی یہ بری بات ہے ایک ایک لفظ کر کے پڑھئے''

ایک عربی رسم الخط نے اٹھ کر کہا:۔

''حضرت یزدانی اپنے مقالہ میں صوبائی زبان کو اپنے صوبے میں کس منصوبے کے تحت۔۔۔۔۔۔''

حاضرین ہنس پڑے اور عربی رسم الخط گھبرا کر بیٹھ گیا

ایک صاحب نے اعتراض کیا:۔

''ہمیں قدرتی حد بندیوں کا احترام کرنا چاہیئے۔''

مقالہ نویس بولے:۔

''حضرت قدرتی حد بندیوں پر بھی ہمارا احترام واجب ہے۔''

صاحب صدر نے اچانک گھڑی پر وقت دیکھا اور بولے:۔

''بھئی میرا پریڈ شروع ہو رہا ہے میں جاتا ہوں۔''

سیکرٹری صاحب نے فوراً کہا:۔

''حضور ابھی پروگرام باقی ہے''

''تو پھر جلدی کریں نہ۔''

اس کے بعد پروگرام جلدی جلدی شروع ہوا۔ یزدانی باقاعدہ تقریر کئے جا رہے تھے اور ان کا زور خطابت اس قدر زوردار تھا کہ ان کے کوٹ کے بٹن ٹوٹ گئے۔ صاحب صدر نے یہ دیکھ کر فوراً اپنے کوٹ کے بٹن بند کر لئے۔ مقالے کے بعد کسی خاتون کا افسانہ تھا جو لکھ نہ سکی تھیں چنانچہ ان کی طرف سے معذرت پیش کی گئی۔ اس معذرت کے بعد لدھانے کے ایک

شاعر آتش نے اپنی غزل گا کر سنائی۔ غزل پسند کی گئی اور پچھلے بنچوں پر بیٹھے عربی رسم الخط فرط مسرت سے جھومنے لگے۔ ان کے ساتھ ساتھ ان کی ٹوپیوں کے پھندنے بھی وجد کر رہے تھے۔ جب پروگرام ختم ہوا تو صاحب صدر نے پوچھا:۔

''اب کیا ہے؟''

سیکرٹری بولے:۔

''اب ختم ہے جناب''

اور اس کے بعد ختم شروع ہو گیا۔

☆

اب جس ادبی محفل کا حال بیان کرنے لگا ہوں یہ شہر کے ایک گنجان محلے میں ایک ہوٹل کے کمرے میں منعقد ہوئی۔ یہ مشاعرہ ٹھیک نو بجے رات شروع ہوا اور دو بجے ختم کر دیا گیا۔ تین شاعر تھے اور حاضرین میں سے راقم الحروف کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس لئے کہ راقم الحروف کے علاوہ وہاں کوئی ''حاضرین'' نہ تھا۔

''حاضرین جس کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک بڑا سا گلدان رکھا ہوا تھا۔ ایک چوہیا خدا جانے کس بل سے نکل کر وہاں تک آتی ذرا رکتی۔۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر ہوا میں مٹھیاں لہراتی اور جلدی سے بھاگ کر واپس چلی جاتی۔ یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے بل کے اندر چوہیوں چوہیوں کی بھی کوئی محفل مشاعرہ منعقد ہے اور یہ چوہیا باہر سے شعر سن کر اندر جاتی ہے اور وہی شعر ترنم سے پڑھ کر داد وصول کرتی ہے۔

شعر خوانی کا دور ختم ہوا تو بحث شروع ہو گئی۔ سرخ ٹائی نے پینترا بدلتے ہوئے کہا:۔

جگر مراد آبادی کا گلاس اس کی شاعری سے زیادہ سریلا ہے نیلا مفلر چیں بچیں ہو کر گویا ہوا۔

''میں کہتا ہوں جگر اس دور کا شیلے ہے''

سرخ ثانی شیلے کی یہ توہین برداشت نہ کر سکی۔

''وہ شیلے نہیں شیلو ہے محض شیلو۔اور اسی شہر میں اس کے ویرانوں میں تمباکو بکے گا۔''

جگر کے عقیدت مند سرخ مظلر نے جگر کا ایک شعر سنایا جس میں محاورے کی بندش اناڑیانہ تھی۔اس کے جواب میں سرخ ثانی نے داغ کا ایک شعر سنایا جس میں محاورے کی بندش اور اس کا استعمال داغ ہی کا حصہ تھی۔

داغ آنکھیں نکالتے ہیں وہ !
ان کو دے دوں نکال کر آنکھیں

رقم الحروف نے ایک شعر سنایا جس میں محاورے کی ذو معنی بندش رقم الحروف کا ہی حصہ ہے۔

داغ پیسے نکالتے ہیں وہ
ان کو دے دوں نکال کر پیسے

اب کالی ٹوپی نے جو بڑی دیر سے چرسیوں کی مانند سگرٹ پی رہی تھی۔میر تقی میر کے ایک شعر کی اصلاح فرمائی۔اصل شعر یوں ہے۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو !
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے

اس کی اصلاح یوں کی گئی:۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی اٹھ کر یہ پھر رونے لگے گا

سرخ ثانی نے اپنی پانچویں غزل ترنم سے پڑھ کر سنائی تو نیچے دالان میں سے ہوٹل کے مالک نے آواز دی:۔

جسے باہر نکلنا ہے نکل جائے دروازہ بند کر رہا ہوں۔''

اور جب ہم وہاں سے باہر نکلے تو رات کے دو بج رہے تھے۔

اب ایک سیاسی الٹ بازی ملاحظہ کیجئے

لاہور کے ایک مشہور اور شان دار ہوٹل کے صحن میں دو تین صحافی ایک مختصر سی اچکن پوش غیر صحافی سے باتیں کر رہے تھے۔اس ہوٹل میں ایک چھوٹی سی پریس کانفرنس ہونے والی تھی۔ اچکن پوش ڈاکٹر آف سائنس (پولیٹیکل) تھے۔اور صحافیوں کے استقبال کیلئے باہر کھڑے تھے۔ایک اور عینک پوش صحافی تشریف لائے اور بولے:۔

''معاملہ کب شروع ہو رہا ہے؟''

''بس شروع ہی سمجھئے۔''

ایک ہفتہ وار اخبار کے ایڈیٹر نے ایک دوسرے ہفتہ وار ایڈیٹر کے کان میں کہا:۔

''میں تو سمجھا تھا کہ ایوننگ سپائل ہو گئی''

ایک شلوار پوش صحافی بھی وہاں آن موجود ہوئے۔آپ نے قریب ہی درختوں کے عقب میں مسجد کے مینار دیکھے اور فرمایا:۔

''الحمدللہ! اگر وقت ہو تو بندہ دو سجدے کر لے۔''

''جی ہاں ابھی وقت بہت ہے۔'' میزبان ڈاکٹر نے تائید کی۔ ہفتہ وار ایڈیٹر ''اس وقت بہت ہے'' سے پر بہت پریشان ہو گیا۔

''ان لوگوں کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔''

اچکن پوش نے پلٹ کر یہ مژدہ سنایا:۔

''چلئے اندر چل کر تشریف رکھیں۔''

کمرہ مختصر اور پرتکلف تھا۔اور درمیان پر مٹھائیوں اور قسم قسم کے پیسٹریوں سے لدی ہوئی میزوں کی لمبی قطار پر دو تین اچکن پوش منڈلا رہے تھے۔ڈاکٹر صاحب ہر نامہ نگار سے ان

کا تعارف کروا رہے تھے۔ اور ان کے دانت سپید تھے۔ بڑے کیک والی کریم کے مانند! یہ بڑا ایک ویڈنگ کیک کے مشابہ تھا۔ اور اسے کاٹنے کا شرف شلوار پوش صحافی کو حاصل ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک طویل مختصر پمفلٹ پڑھ کر سنایا جسے کچھ نامہ نگاروں نے ہمہ تن گوش ہو کر سنا۔ اور کان سے سنا اور دوسرے سے ہمہ تن گوش ہو کر نکال باہر کیا ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:۔

''یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ کہ رائے ریاست ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بھی اس نیک مقصد میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں۔

ایک صاحب نے کریم رول میں کافی دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا:۔

''کیا وہ بھی دلچسپی لے رہے ہیں؟''

جی ہاں وہ بڑے ایڈوانسڈ قسم کے نوجوان ہیں۔ آپ صرف اسی ایک بات سے ان کی ترقی پسند طبیعت کا اندازہ لگالیں کہ انہوں نے مجھے اپنے خط میں ''پیارے بھائی'' لکھا ہے۔ یہی چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ جو بعد میں ایک جگہ جمع ہو کر بڑی بڑی خوبیاں بن جاتی ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

آپ نے کیک پیس کی پلیٹ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا:۔

''جی ہاں' جی ہاں' یہی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں۔ جو بعد میں ایک جگہ جمع ہو کر بڑے کیک کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب سے جو کوئی بھی سوال پوچھتا منہ میں کیک یا پیسٹری ڈال کر پوچھتا اور ڈاکٹر صاحب کو جھک کر پوچھنا پڑتا:۔

''کیا فرمایا؟''

اور اس محفل میں ان گنت سوال پوچھے گئے۔

☆

لاہور کالج فار وومن کے میگزین میں ایک طالبہ پارہ ہائے خیال کے عنوان سے کچھ غیر شعوری اور بے خیالی کی باتیں کی ہیں۔ تین پارہ ہائے خیال ملاحظہ ہوں۔

☆ کل شب میں اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ اٹھی' بڑھی کواڑ کھولا' کسی کو نہ پایا۔ عالم حیرانی میں واپس ہوئی تو دیکھا کہ وہ تو میرے ہی دل کی دھڑکن تھی۔

☆ کسی کو خیال میں لانا بس کی بات ہے۔ مگر کسی کے خیال میں جانا بس کی بات نہیں۔

☆ میں جب صرف میں ہوتی ہوں تو دیکھتی ہوں کہ کوئی مجھے دیکھتا ہے۔

ان ٹکڑوں کے مقابلے میں راقم الحروف کی کیا جرائت ہے کہ وہ کچھ کہہ سکے لیکن پھر بھی کچھ اپنے دل کے ٹکڑے صفحہ قرطاس پر رقم کر کے اس میگزین کے ایڈیٹر کو بھیجنا چاہتا ہوں۔ مثلاً تین ٹکڑے یوں ہوں گے:۔

☆ کل شب میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی اٹھا' بڑھا' کواڑ کھولا' دیکھا تو حیران رہ گیا کہ ہوٹل کا مالک تین مہینوں کے بل لئے کھڑا ہے۔

☆ ماڈل ٹاؤن بس میں سوار ہونا بس کی بات ہے۔ مگر باہر نکلنا بس کی بات نہیں۔

☆ میں جب صرف میں ہوتا ہوں تو دیکھتا ہوں۔ کہ مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔

☆

ہوٹل ارجن ٹینا لاہور کے بہت سے شعراء ناشر اور ادب نواز طبقہ موجود تھا یہ تقریب ایک مجموعہ کلام کی اشاعت پر منائی جا رہی تھی۔ سب سے پہلے قاسمی صاحب نے تقریر کی۔ ان کے بعد صدر نے اعلان کیا کہ ظہیر کاشمیری اپنے مخصوص انداز میں فیض کی کوئی پسندیدہ نظم

پڑھ کر سنائیں گے۔ ظہیر صاحب پنڈلی کھجلاتے ہوئے اٹھے اور اپنے خاص انداز میں نظم پڑھنی شروع کر دی۔ خاص طور پر سامعین نے ظہیر صاحب کی وساطت سے فیض کو خوب داد دی۔

اس بام سے نکلے گا ترے حسن کا سورج
اس کنج سے پھوٹے گی کرن رنگ حنا کی
اس در سے بہے گا۔ تری رفتار کا سیماب
اس راہ سے چھوٹے گی شفق تیری قبا کی

ظہیر صاحب کچھ اس انکسار و اہتمام سے داد وصول کر رہے تھے۔ جیسے وہ اس داد کو فیض تک پہنچانے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں ____ انہوں نے آخری مرتبہ پنڈلی کھجلائی اور اپنی خوف ناک ٹوپی ٹھیک طرح سے جماتے ہوئے کرسی پر جم کر بیٹھ گئے۔

اتوار کی صبح کو موچی دروازے کے باغ میں ایک مذہبی جماعت کا جلسہ ہوا یہ جلسہ جس وقت شروع ہو جانا چاہیے تھا اس وقت سٹیج سیکرٹری لوگوں کو گھاس پر بیٹھ جانے کی تلقین کر رہے تھے۔ مگر لوگ پھر بھی کھڑے تھے۔ غالباً یہ لوگ اس بات کا اندازہ کرنا چاہتے تھے۔ کہ کتنے لوگ بیٹھ چکے ہیں۔ بیٹھے ہوؤں کا کام مولیاں کھانا اور کھڑے ہوؤں کا کام مولیاں کھانے والوں کو گھورنا تھا۔ اور سٹیج سیکرٹری کا کام ہر دو منٹ کے بعد چیخ اٹھنا تھا۔

"سامعین! جو لوگ درختوں کے نیچے کھڑے ہیں۔ وہ درختوں کے نیچے بیٹھ جائیں۔ اور جو لوگ اس کونے میں کھڑے ہیں۔ وہ اس کونے میں بیٹھ جائیں کیونکہ وہ کونہ کھڑے ہونے کے لئے نہیں ہے۔"

کسی ستم ظریف نے آواز لگائی:۔

"اور کھڑے ہونے کے لئے کون سا کونہ ہے؟"

سٹیج سیکرٹری نے غصے میں کہا:۔

"وہ نہیں ہے۔"

اس ستم ظریف نے پوچھا:۔

تو پھر لوگ جلدی جانا چاہتے ہیں۔ وہ کہاں کھڑے ہوں؟

ایک صاحب بولے:۔

"وہ جہاں کھڑے ہیں وہیں کھڑے رہیں"

لوگ کافی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ جنھیں دریوں پہ جگہ نہ ملی تھی۔ وہ گھاس پر بیٹھے تھے۔ زمین پر بیٹھ گئے تھے۔ جنھیں زمین پر جگہ نہ ملی تھی۔ وہ درختوں پر چڑھ گئے تھے۔ اور جو درختوں پر نہ چڑھ سکتے تھے۔ وہ درختوں پر چڑھ گئے تھے۔ سٹیج سیکرٹری چیخ کر بولے:۔

"سامعین! ان حضرات کو اس بلاک کی طرف بھیج دیں۔ وہ پریس کے آدمی ہیں۔"

ایک آدمی جھٹ بول اٹھا:۔

"ہم بھی پریس کے آدمی ہیں"

سپاہی نے پوچھا:۔

"کس پریس سے آئے ہیں؟"

وہی آدمی بولا:۔

"گیلانی پریس سے"

اب جلسہ شروع ہو چکا تھا۔ اور لیڈران قوم دھواں دھار تقریریں کر رہے تھے۔ اور بار بار پانی پی رہے تھے۔ اور قرآن حکیم میں آیات خداوندی کے حوالے دے رہے تھے۔ لوگ

اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تھے۔اور جو پہلے سے بیٹھے تھے اوہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔اور انہوں نے چل پھر کر تماشا دیکھنا شروع کر دیا تھا ایک آدمی نے چلغوزے کھاتے ہوئے اپنے ساتھی سے پوچھا:۔

''بھیاجی! یہ میرے بھائی کیا چاہتے ہیں؟''

''کون بھائی؟''

''یہی قرآن کی آیات پڑھنے والے''

اس کے ساتھی نے بیڑی کا دھواں اگلتے ہوئے کہا:۔

''تم چلغوزے ذرا ادھر کرو''

پاکستان اور ہندوستان کے درمیان جائیدادوں کے تبادلے کا مسئلہ ابھی زیر بحث ہے۔لیکن رسالوں اور کتابوں کا تبادلہ بڑی آسانی سے اور بغیر کسی انڈو پاک کانفرنس کے ہو رہا ہے۔اگر دلی سے ''بیسویں صدی'' چھپتا ہے۔تو اب کراچی سے بھی چھپنے لگا ہے۔اگر پاکستان میں ''نقوش'' تھا تو اب ہندوستان سے بھی نقوش شائع ہو رہا ہے۔یہ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔رسالوں اور کتابوں کے بعد شاعر بھی چوری ہونا شروع ہو گئے ہیں۔دلی کے ایک ادبی ماہنامے میں دکن کے کسی احمد ندیم قاسمی کا تازہ کلام شائع ہوا ہے۔جسے پاکستان کے احمد ندیم قاسمی نے اپنا کلام تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔لاہور کے ایک ایکٹر نے اپنا اصلی نام خیر دین ترک کر کے راجکپور رکھ لیا ہے۔اگر شخصیتوں کے تبادلے کی رفتار یہی رہی تو کچھ عرصہ بعد اگر لاہور میں انڈو پاک مشاعرہ ہوا تو ہندوستان سے آنے والے شعراء میں احمد ندیم قاسمی۔مجید امجد۔سیف الدین سیف اور قیوم وغیرہ ہوں گے اور پاکستان کی طرف سے اختر الایمان' فراق گورکھپوری اور جوش ملیح آبادی شریک ہوں گے۔پھر کافی ہاؤس میں اکثر یہ منظر دیکھنے میں آئے گا۔کہ کوئی صاحب دو ادیبوں کا تعارف

کرواتے ہوئے کہہ رہے ہیں۔

''آپ قیوم نظر ہیں۔اور ابھی قیوم نظر ہیں۔''

شہر کے ایک مشہور مسلم ہائی سکول کے لائبریری روم میں مجلس مباحثہ گرم تھی اس مباحثے میں صرف طلباء تقریریں کر رہے تھے۔دسویں جماعت کا ایک ضرورت سے زیادہ سنجیدہ لڑکا صدر تھا۔اور لڑکے باری باری سٹیج پر آکر موضوع بحث کی مخالفت یا حمایت میں تقریریں کر رہے تھے۔موضوع تھا۔

''کیا تعلیم کا مقصد تلاش روزگار ہے''

موضوع بڑا ماڈرن اور دل چسپ تھا۔لطف کی بات یہ ہے کہ تقریر مخالفت میں ہو یا حمایت میں' حاضرین ہر طالب علم کو داد دیتے اور تالیاں پیٹ کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے کلاس ہجم کے ایک طالب علم کی تقریر سب سے اچھی اور مدلل تھی لیکن انعام دسویں حمایت کے ایک لڑکے کو ملا۔اس لڑکے کے کپڑے بڑے قیمتی تھے۔

بحث کے دوران میں کسی لڑکے نے کوئی شرارت کی جس سے مشتعل ہو کر سیکنڈ ماسٹر اٹھے۔چھڑی ہوا میں لہرائی اور لڑکے کو تابڑ توڑ پیٹنا شروع کر دیا جب چھڑی ٹوٹ گئی تو لاتوں کی بارش شروع کر دی۔مجھے یقین ہو گیا کہ تعلیم کا مقصد جو کچھ بھی ہے۔اس پر سیکنڈ ماسٹر صاحب بڑی اچھی طرح عمل پیرا ہیں۔

جن دنوں ہماری ٹیم بھارت میں کرکٹ کے میچ کھیل رہی تھی۔شہر لاہور میں اس کے بڑے چرچے تھے۔ہر آدمی کرکٹ مائنڈڈ ہو رہا تھا۔بوڑھے کھلاڑی شام کو گلی کوچوں میں جما کر تختوں اور چارپائیوں پر بیٹھ جاتے اور سننے والوں کو بتاتے کہ کرکٹ کیوں گرتی ہے۔اور اگر ران سے گیند چھوے جائے تو کھلاڑی کیوں آؤٹ ہو جاتا ہے۔.................

دوکانوں پر سے کرکٹ کا سامان بڑی تیزی سے بکنا شروع ہوگیا تھا۔گلی گلی نئی کرکٹ کی ٹیمیں تشکیل پذیر ہورہی تھیں وہ لڑکے جو شام کو سینما گھروں کی طرف نکل جاتے تھے۔اب میدانوں میں کرکٹ کھیلتے دکھائی دیتے تھے۔ ہمارے چوک میں بھی کرکٹ کا بڑا زور تھا۔ریڈیو پر لوگ کومنٹری سننے کے لئے پروانوں کی طرف گرتے تھے۔اپنے کھلاڑیوں کی تعریفوں کے پل باندھتے تھے۔اور دوسرے کھلاڑیوں کے پل توڑتے تھے۔

ہمارے خواجہ صاحب پان کے بڑے رسیا ہیں۔آپ کو احمد آبادی پانوں سے عشق ہے۔جن دنوں ہماری ٹیم احمد آباد میں میچ کھیل رہی تھی۔کسی نے خواجہ صاحب کو وہاں کا حال سنایا آپ نے کہا:۔

''خوش قسمت ہیں بھائی! احمد آباد کے پان تو کھاتے ہوں گے نا'' ان ہی دنوں چوک میں بھی ایک کرکٹ کلب بنانے کے مسئلے پر بڑے زور شور سے بحث ہو رہی تھی۔ جادے پہلوان کا خیال تھا کہ بلے امریکہ سے منگوائے جائیں ایک پہلوان مصر تھے۔کہ گیند مصر سے آئیں گے۔خلیفہ بولا:۔

''تو گراؤنڈ قسطنطنیہ میں بنوائیں گے۔''

یہ قسطلم طنیہ ان کا قسطنطنیہ ہے۔اور انہیں اس ملک سے جانے کیوں بڑی محبت ہے وہ ہر بات پر اس شہر کا ذکر ضرور کریں گے۔اگر کوئی ان سے پوچھ بیٹھے:۔

''یہ اتنا میٹھا گڑ کہاں سے آگیا؟''

''قسطلم طنیہ سے''

اب گورنمنٹ کالج کی ایک مجلس ادب کا حال سنیے:۔

اس مجلس کا پروگرام تین بجے بعد از دوپہر شروع ہوا میں جس وقت وہاں پہنچا ایک ریڈیو سنگر شاعر راگ ایمن میں غزل پڑھ رہے تھے۔یا یوں کہیئے کہ اپنی غزل میں راگ ایمن گا رہے

تھے۔ ہال نصف کے قریب بھرا ہوا تھا۔اور باقی کرسیاں پچھلی قطار تک خالی تھیں۔سٹیج کے آزو بازو ایک طرف خواتین بیٹھی تھیں اور دوسری جانب شعراء حضرات تشریف فرما تھے۔ میز پر گلدان پڑا تھا۔جس میں دو تین کاغذی پھول اندھی سے دیکھنے کی کوشش کررہے تھے۔ پیچھے صاحب صدر اونچی لمبی کرسی کی گود میں بیٹھے تھے۔ایک شاعر نے مطلع پڑھا:۔

میں نے جو ساز اٹھایا ہوگا

کون اس ساز پہ گایا ہوگا

درمیان سے آواز آئی:۔

''چار سو بیس کرایا ہوگا''

سٹیج سیکرٹری نے تالیوں کے شور میں دوسرے شاعر کے نام کا اعلان کیا جو متاثر تخلص کرتے تھے۔وہ پہلے تو بالکل نہ اٹھے۔ حاضرین کے اصرار نے بھی انہیں متاثر نہ کیا لیکن صاحب صدر کا اشارہ پاتے ہی فوراً اٹھے اور سٹیج تک اٹھتے چلے گئے ان کے اشعار سے صاحب صدر بہت متاثر ہوئے۔ ان کے بعد سیالکوٹ کے ایک طالب علم شاعر آئے اور ایک انتہائی طویل غزل شروع کردی کسی شعر پر اگلی قطاروں میں سے آواز بلند ہوئی۔

''پھر پڑھیے''

اس پر پچھلی قطار چیخ اٹھی۔

''اگلی قطار والو! پچھلی قطاروں پر رحم کیجئے۔''

غزل ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ایک عینک پوش طالب علم تنگ آکر بولے:۔

''ایک سو بیاسیواں شعر پڑھیے۔'' آخر تالیوں کے پر زور شور اور اصرار پر شاعر کو مجبوراً اترنا پڑا جاتے ہوئے انہوں نے غصے میں آکر اپنی غزل پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کردی عینک پوش چیخ اٹھے۔

''ارے ظالم! اب اردو ادب کا کیا ہوگا؟''

جب مشاعرے کا رنگ بگڑنے لگا لوگ بور ہونا شروع ہو گئے۔ اور مجبوراً پھر سے ریڈیو سنگر کو بلایا گیا۔ جنہوں نے اب کے نئک راگ میں اپنی غزل گائی۔ انہیں ہر شعر اور ہر شعر کے ترنم پر داد ملی۔ بعد ازاں ان سٹیج سیکرٹری تالیوں کے زبردست شور میں کچھ پڑھتے چلے گئے۔ جب شور مدھم ہوا تو پتہ چلا کہ آپ اپنی غزل سنا رہے تھے۔ انہوں نے ایک ٹیڑھی گردن والے شاعر کو بلایا جس نے گردن لٹکا کر بڑے ٹیڑھے میڑھے شعر پڑھنے شروع کر دیئے۔ ایک شعر پر وہی عینک بولی:۔

''سبحان اللہ! آپ ہی کا شعر معلوم ہوتا ہے۔''

اس دوران میں ایک سٹوڈنٹ بار بار ہماری ٹولی میں آ کر ماچس مانگ رہا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ہماری منڈلی میں آ کر کہتا تھا:۔

''سگرٹ کے لئے ماچس دینا۔''

اور دوسری ٹولی میں جا کر کہتا تھا:۔

''ماچس کے لئے سگرٹ ہوگا؟''

ایک شاعر نے انتہائی دقیق اور موٹے الفاظ والا شعر پڑھا۔ عینک پوش گردن جھٹک کر بولے:۔

''واہ واہ اس شعر کا مزہ تو کچھ گھر جا کر ہی آئے گا۔''

ان کے ساتھی بولے:۔

''اگر یاد رہا تو''

عینک نے کہا:۔

''مجھے بھول جانے والے شعر اکثر یاد رہتے ہیں''

اخبارات میں جو ہر ہفتے قسمت علمی و ادبی شائع ہوتی رہتی ہے وہ ہمارے ادیبوں اور شاعروں کے لئے ایک خاصہ دلچسپ اور محنت طلب مسئلہ ہے اخبار کے حق میں علم و ادب کی یہ قسمت بڑی نیک ہے لیکن عام طور پر ادیبوں اور شاعروں کے حق میں صحیح معنوں میں بدقسمتی و ادبی ہے۔ چند ایک اخباروں کو چھوڑ کر باقی سبھی اخباروں میں مضامین نظم و نثر کا معاوضہ بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ اور ادیبوں کو یہ چھوٹی سی رقم حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً ایک بار لاہور کے ایک مشہور شاعر اپنا معاوضہ لینے گئے تو اپنے ساتھ دوائی کی خالی بوتل بھی لیتے گئے خزانچی کے پاس بیٹھتے ہی انہوں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور بوتل میز پر رکھ کر فرمانے لگے:۔

کل سے والدہ کی بڑی حالت ہے۔ اگر آج دوائی نہ ملی تو ان کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

نتیجہ یہ ہوا کہ خزانچی کا دل پسیج گیا۔ اور شاعر کو وقت سے پہلے ہی پیسے مل گئے وہ جلدی سے گھر پہنچے۔ دوائی کی شیشی اپنی الماری میں رکھی اور ٹی ہاؤس میں آ کر میکرو پولو کے سگرٹ کے ساتھ چائے کا لطف بھی اٹھانے لگے۔

ایک اور صاحب ہیں جو ہر اخبار میں اپنا مضمون چھپواتے ہیں۔ اور جس روز انہیں معاوضہ لینے جانا ہوتا ہے۔ تو اس ڈر سے کہ کہیں تاریخ نہ پڑ جائے باقاعدہ میک اپ کر کے جاتے ہیں۔ اس موقع کے لئے انہوں نے خاص قسم کا سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا کوٹ۔ قمیض کے بٹن ٹوٹے ہوئے۔ بال الجھے ہوئے۔ بوٹوں کے تسمے ندارد قدموں میں لڑکھڑاہٹ آواز میں آئیں۔ یوں خزانچی کے کمرے میں داخل ہوں گے جیسے تعزیہ امام باڑے میں داخل ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوگا۔ جیسے ابھی ابھی اپنی والدہ کو سپرد خاک کر کے چلے آ رہے ہیں۔ بڑی نقاہت سے کرسی پر بیٹھ جائیں گے پہلے دنیا کی بے ثباتی کے بارے

میں تین چار جملے کہہ کر خزانچی کو ڈرائیں گے پھر ارشادات نبویؐ میں سے محنت کشوں کے حق میں کچھ اقتباسات سنائیں گے۔اور آخر میں ارشاد ہوگا۔

''راشن کی آخری تاریخ بھی چلی گئی۔گھر میں رات سے فاقہ ہے۔''

اور جب خزانچی کسی خوف کی وجہ سے انہیں سب سے پہلے معاوضہ دے دیگا تو وہ گھر پہنچ کر پہلے میک اپ تبدیل کریں گے۔اور بعد میں کسی ہوٹل کا رخ پکڑیں گے۔ایک ادیب ہیں۔جو ایک مدت سے دفتر میں یہ کہہ کر ان کا لڑکا بیمار ہے پیسے جلدی لے جاتے تھے۔بعد میں خزانچی کو پتہ چلا کہ اس ادیب کی ابھی تک شادی بھی نہیں ہوئی۔

لاہور میں (خدا بخشے) ایک اخبار ہوا کرتا تھا۔کہتے ہیں کہ اس اخبار کے ایڈیٹر نے اپنے شاعروں اور ادیبوں کو معاوضہ دینے کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کر رکھا تھا۔جب کوئی ادیب اپنا معاوضہ طلب کرنے دفتر میں تشریف لاتا تو آپ بڑے احترام اور ادب کے ساتھ پیش آتے انہیں کرسی پر اپنے پاس بٹھاتے اور یقین دلاتے کہ دوسرے دن انہیں معاوضہ ضرور مل جائے گا۔انہیں چھوڑنے دروازے تک آتے اور جب رخصت ہونے لگتے تو اپنی جیب سے ایک دستی بم نکال کر شاعر کی جیب میں ڈال دیتے اس کے بعد جھک کر رخصتی مصافحہ کرتے اور واپس اپنے کمرے میں آجاتے پھر سیڑھیوں میں ایک زبردست دھماکا ہوتا اور اخبار نہ صرف معاوضے کی بک بک سے بلکہ شاعر سے بھی نجات حاصل کر لیتا۔

وائی۔ایم۔سی۔اے کی عمارت میں ہر اتوار دو تین عربی اجلاس ہوا کرتے ہیں ایک علمی و ادبی حلقہ ایسا ہے۔جو واقعی ''نجیب الطرفین'' ہے۔یہ واحد حلقہ ہے جہاں اجلاس میں شروع ہونے کے بعد بھی گپ بازی رہتی ہے۔جس ایک محفل کا میں ذکر کرنے والا ہوں۔اس کے پروگرام میں سیکرٹری حلقہ ہذا کی غزل تھی۔سیکرٹری صاحب انتہائی مختصر سے آدمی تھے۔جو صاحب صدر کے پہلو میں کرسی کی گود میں بیٹھے تھے۔جب آپ غزل پڑھ چکے تو ایک

فرنچ کٹ داڑھی نے مدھم سر میں اعتراض کیا:۔

صاحب صدر پہلے ''س'' کی ''ی'' دب رہی ہے' صدر بولے:۔

''ہم اس دبتی ہوئی ''ی'' کو کیسے نکال سکتے ہیں۔''

آغا صاحب بولے:۔

''ہلکی سی غزل ہے''

فرنچ داڑھی پھر بولی:۔

''ی'' اس کی بھی دبتی ہے''

مقالہ تھا۔حیات اقبال کی گم شدہ کڑی' اور لکھنے والے اقبال کے ان ہزار دوستوں میں سے تھے۔جن کا مضمون ''جب میں اقبال کے پاس گیا۔تو وہ اچھل کر بولے آخاہ! حضرت ادھر کیسے بھول پڑے؟'' سے شروع ہوا کرتا ہے۔صاحب مقالہ اقبال کی گم شدہ کڑی تلاش کرتے کرتے خود بھی کہیں گم ہو گئے تھے مقالہ نگار غیر ضروری تفصیلات میں اس درجہ کھو گئے تھے۔کہ پورا مقالہ غیر ضروری اشیاء کا انبار بن کر رہ گیا تھا۔مثلاً:۔

''ہمارا جہاز نہر سویز میں سے گذرا۔نہر سویز مشہور فرانسیسی انجینئر نے بنائی ہے اس کی گہرائی۔۔۔فیٹ ہے۔چوڑائی۔۔۔۔۔فیٹ ہے۔اس کی کھدائی پر۔۔۔۔۔۔۔روپیہ خرچ آیا۔۔۔۔۔۔ساتھ ہی فرمایا:۔

''اور جدہ پہنچ کر نوجوان لڑکوں کا ایک نہایت خوبصورت گروہ جہاز پر آیا۔''

مقالہ نگار نے لفظ نہایت' پر اس قدر زور دیا کہ وہ لفظ ہی ٹوٹ گیا۔

''اقبال مشرق کے عاشق تھے۔جیسا کہ خاکسار ہے۔وہ فرمایا کرتے تھے کہ مشرق کا دل پھیل رہا ہے۔

ایک آواز:۔جیسا کہ مضمون پھیل رہا ہے۔اس محفل میں ہر شخص نے اپنے اپنے کمالات

دکھائے۔ اقبال نے مزاحیہ اشعار سنائے اور اس خاکسار نے تاش کے کھیل دکھائے اس کے بعد اقبال ہمبرگ تشریف لے گئے''

اس کے ساتھ ہی ہال میں سے کچھ آدمی بور ہو کر باہر تشریف لے گئے۔ بعد ازاں اقبال جہاں بھی تشریف لے جاتے ہال میں سے دو تین آدمی ضرور ساتھ ہی باہر نکل جاتے۔ چنانچہ جب مقالہ ختم ہوا اور اقبال لاہور واپس آئے تو ہال میں گنتی کے چند آدمی باقی رہ گئے تھے۔ اب اعتراضات شروع ہوئے ایک صاحب نے اعتراض کیا:۔

اقبال جب مراقبے میں گئے تھے۔ تو اس کی علت غائی کیا تھی؟''

ایک دبلا پتلا آدمی رونی صورت بنا کر پوچھنے لگا:۔

خدا کے لئے مجھے یہ بتایئے کہ اس مقالے کی علت غائی کیا تھی؟''

آقا صاحب نے عینک اتارتے ہوئے کہا:۔

''ذرا اس نکتے پر نظر رکھیئے کہ جب۔۔۔۔۔۔''

لیکن وہ نکتہ عینک اتر جانے پر خود آقا صاحب کی نظروں سے بھی غائب ہو گیا تھا۔ یہ بڑا باریک نکتہ نگاہ تھا۔ جو عینک اتر جانے پر فوراً گم ہو جاتا تھا۔ بدل جاتا تھا۔ آخر میں کسی علامہ صاحب نے انگریزی میں ایک نظم سنائی۔ ان کے ایک دوست انہیں اس محفل میں محض تفریحاً لائے تھے۔ چنانچہ نظم پر انہیں خوب داد ملی خوب مذاق اڑایا گیا۔ فرنچ کٹ داڑھی کو پھر تکلیف ہوئی:۔

جناب لفظ PAINS کا ''S'' دب رہا ہے''

ایک آواز:۔ شاید اسی لئے لفظ درد کر رہا ہے۔''

دوسری آواز:۔ انگریزی میں کچھ نہیں دبا کرتا بھائی۔''

جب بھی کوئی نئی انجمن منصۂ شہود پر آتی ہے۔ تو اس کا پہلا اجلاس بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ اسی

قسم کے اولین اجلاس کی کارروائی کا حال سنیے یہ ادبی انجمن شہر کی ایک انتہائی تنگ و تاریک اور پراسرار گلی میں طلوع ہوئی تھی اور پہلے اجلاس کی صدارت ایک وکیل صاحب فرما رہے تھے۔ شاعر صدر کے پہلو میں دبے بیٹھے تھے۔ اور عینک کے گول گول شیشوں میں سے لوگوں کو گھور رہے تھے ایک صاحب نے اعتراض کیا:۔

''غزل کا مطلع صاف نہیں ہے''

شاعر کی عینک ناک کی چونچ پر تھرتھرائی۔ صدر نے اپنی عینک درست کرتے ہوئے فرمایا۔

''اپنا اعتراض واضح کیجئے''

معترض صاحب کھڑے ہو گئے وہ اس قدر پست قد تھے کہ لوگوں کے پرزور اصرار پر انہیں مجبوراً کرسی پر کھڑے ہونا پڑا۔

کرسی پر کھڑے ہو کر انہوں نے فرمایا۔

''مطلع میں شاعر اپنا مافی الضمیر بیان نہیں کر سکا۔

شاعر بولا

''معاف کیجئے گا مافی الضمیر بڑی ذاتی شے ہوتی ہے اسے کبھی کوئی بیان نہیں کیا کرتا۔

اس جواب پر سب سے پہلے صدر صاحب ہنسے اور بعد میں سارا کمرہ قہقہوں' تالیوں اور سیٹیوں سے گونج اٹھا۔ کچھ لمحے بعد صاحب غزل اپنے ساتھی سے مافی الضمیر کے معنی پوچھ رہے تھے اور ندامت کا اظہار کر رہے تھے۔ اب جو صاحب تشریف لائے ان کی داڑھی آزاد کٹ تھی اور کالی کٹ کے رہنے والے معلوم ہو رہے تھے۔ انہوں نے بڑے خضوع و خشوع سے گیت سنایا۔

ناؤ بھنور میں دور کنارا
کون بندھائے دھیر ہماری

پھوٹ گئی تقدیر۔۔۔۔۔۔

آزاد کٹ داڑھی چپ ہو کے بیٹھ گئی اور لوگوں نے بولنا شروع کر دیا۔اور وہاں اصلی مچھلی بکنا شروع ہو گئی۔مجبوراً صاحب صدر کو مداخلت کرنا پڑی۔

حضرات! مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ یہ علمی۔ادبی اجلاس ہو رہا ہے موچی دروازے کے باہر کوئی جلسہ نہیں ہو رہا۔''

ایک بزرگ نے تائید کہا۔

''بالکل ٹھیک ہے آخر ہم لوگ جو اپنا وقت ضائع کر کے یہاں آئے ہیں۔تو اپنا وقت ضائع کرنے نہیں آئے۔

حاضرین خاموش ہو گئے اور جلسے کی کاروائی پھر شروع ہو گئی۔ایک صاحب بولے۔

''جناب صدر یہ شعر جغرافیائی اعتبار سے غلط ہے''

شاعر بولے۔

کیوں جناب!

خط سرطان اس کے قریب سے ہو کر نہیں گذرتا؟

ایک آواز:۔

بلکہ وہ تو اس شعر کے اندر سے ہو گزرتا ہے۔

دوسری آواز:۔

''شاعر کہاں سے گذرتا ہے؟''

''خاموش! خاموش!''

صدر نے زور سے میز پر مکا مارا اور ہاتھ سہلاتے ہوئے فرمایا۔

''مجھے بار بار میز پر مکا مارنا پڑ رہا ہے۔آخر آپ لوگ خاموش کیوں نہیں ہو جاتے۔سائلنس

پلیز!

دوسری جانب سے آواز آئی!

''پلیز پلیز''

اب جلسے کی کاروائی ایک بار پھر خاموشی سے شروع ہوئی۔یعنی ہر شخص اپنی اپنی جگہ چپ ہو گیا۔

ایک منٹ۔ڈیڑھ منٹ'دو منٹ'صدر تنگ آ کر بولے۔

حضرات آپ خاموش کیوں ہیں؟

کچھ تو کہیے''

ایک صاحب جو افسانہ نویس تھے ماتھے پر آئے ہوئے بال جھٹک کر بولے:۔

''جناب اگر آخری بند میں لہر کی جگہ موج کا لفظ ہوتا۔تو زیادہ مناسب تھا۔

اس پر شاعر نہ رہ سکے فوراً بولے۔

''اگر آج کے جلسے میں میرے گیت کی جگہ آپ کا افسانہ ہوتا تو کیا خیال ہے؟

''آپ برا نہ مانیں۔میرا مطلب ہے کہ لہر کا لفظ ہندی ہے۔

ایک آواز:۔لیکن عشق لہر پاکستانی کیوں تھا؟''

کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا اور صاحب صدر میز پر مکا مارتے رہ گئے۔بحث پھر شروع ہو گئی۔

ایک صاحب مونچھوں کے سرے مروڑتے ہوئے اٹھے اور آنکھیں چھت کی جانب گھماتے ہوئے بولے۔

صدر محترم و معزز حضرات!

کیا خیال ہے یہ روش ہمیں ختم کر دینی چاہیے کہ شعر میں ایک مصرعہ فارسی کا ہے اور ایک اردو

کا چلا آرہا ہے۔

میرے خیال میں یا تو دونوں مصرعے فارسی میں ہونے چاہئیں یا دونوں اردو کے ہوں۔

کیا خیال ہے آپ کا؟

مغربی کونے سے ایک نیم مردانہ آواز بلند ہوئی

''اور اگر دونوں انگریزی کے ہوں تو کیا خیال ہے آپ کا؟

صاحب صدر نے دونوں خیالات کو ختم کر دیا۔اور لیکچر پلانا شروع کر دیا۔

''میرے خیال میں آخری بند میں قلم کا وزن میں پورا نہیں اترتا''

بے قد کا پروفیسر نما آدمی اٹھ کر مصرعے کی تقطیع کرنے لگا۔

فعلن، فاعلن، فعیلن، فعل

ساتھ ہی آواز آئی:۔

پاہن، پاسن، پاس

صاحب صدر میز پر مکا مار کر خود بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ چلئے'' حضرات یہ بودی سائنس کا تکیہ نہیں ہے۔ادب سے باہر مت جائیے۔''

''اور اگر ادب خود اپنے دائرے سے باہر ہو؟''

حاضرین خاموش ہو گئے۔ کچھ لوگوں نے اپنے اردگرد ادب کے دائرے کھینچ لیے۔

ہاں تو ______ قلم کا کے اوزان یعنی عمل اور اس کا۔''

لکا کہیے۔لکا پنجابی ہے۔

خاموش رہیے''

صاحب صدر بولے'

'حضرات میرے خیال میں اس گیت پر کافی بحث ہو چکی ہے۔

اب ہمیں آگے چلنا چاہیے۔

حاضرین نے صاحب صدر کے اس خیال پر لبیک کہا۔صاحب صدر آگے چل پڑے لیکن فوراً پیچھے پلٹ آئے کیوں کہ آگے پروگرام افسانے کا تھا۔اور صاحب افسانہ تشریف لائے تھے۔ان کے دوست اٹھ کر ان الفاظ میں معذرت کی۔

''چونکہ صاحب افسانہ کو آستانہ داتا پر حاضری دینے جانا تھا۔اس لئے وہ یہاں نہ آ سکے۔انہوں نے طبلے باندھتے وقت مجھے خاص طور پر آپ سے معذرت پیش کرنے کے لیے کہا تھا۔

لوگوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور صاحب صدر رقت بھرے لہجے میں بولے۔''

''حضرات! چلئے داتا صاحب کے مزار پر چلئے''

پچھلی بہار کی ایک شام کو دیال سنگھ کالج کے ہوسٹل میں ایک مختصری ادبی نشست کا انتظام کیا گیا۔

ہم لوگ ذرا لیٹ پہنچے لیکن خیر دلچسپی کافی رہی۔

اس وقت ایک صاحب غزل پڑھ کر جا رہے تھے۔

اور دوسرے جنہیں ہم نے کبھی شعر سناتے نہ دیکھا تھا۔

غزل پڑھنے کے لیے پر تول رہے تھے۔

سامعین نے پکارا:۔

ترنم سے پڑھیے۔

شاعر بتیسی نکال کر بولے''

حضرات میں نے ابھی طرز بنائی نہیں ہے۔

نظر نے کہا:۔

کوئی ایسی غزل سنائیے جس کی طرز بیٹھی ہوئی ہو۔

ہمارے لیے اس آدمی کے شاعر ہونے کا صدمہ کیا کم تھا کہ اس کا ترنم بھی سننا پڑا۔ شاعر نے تحت اللفظ پڑھنا شروع کیا۔ پہلا شعر سر سے پاؤں تک اوٹ پٹانگ تھا۔

پھر بھی انہیں داد ملی۔ ایک ''بدمذاق'' نے کسی کونے سے کہہ دیا۔

''آپ ترنم ہی سے سنائیں''

اس کے بعد امرتسر کے اک شاد کی باری تھی۔ جنہوں نے آتے ہی کیدارے کے سر اٹھا لئے اور انہیں اٹھا کر اتنا اوراوپر لے گئے کہ واپس آتے ہوئے گھبرانے لگے۔ چنانچہ انہیں وہیں چھوڑ کر بھاگ آئے۔ اور جب واپس آئے تو لوگ جا چکے تھے۔

بہار کی وادی

پنجاب ٹرانسپورٹ کی بس پورے چھ بجے لاہور سے چلی اور ساڑھے چار بجے پنڈی پہنچ گئی۔ موسم گرد آلود تھا۔ اور گرمی اور تپش میں پنجاب کے میدان ہانپ رہے تھے۔ بس میں دیگر مسافروں کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کی بھاری بھرکم عورت بھی تھی جو اپنے نصف درجن بچوں اور مرغیوں کے ایک ڈربے کے ہمراہ پنڈی جا رہی تھی اس نے ملازم کو ہدایت کی تھی کہ ڈربہ چھت پر نہ رکھے۔ بارش میں مرغیاں بھیگ جائیں گی۔ لیکن ملازم نے مرغیوں کو اپنے ساتھ والی سیٹ پر رکھا اور وہ سارا راستہ کڑکڑ کرتی گئیں۔

اور ان کی مالکن بھی سارا راستہ کڑکڑ کرتی گئی۔

جہاں بس رکتی وہ بچوں کو چائے پانی لیمن پلاتی۔

پان بندھواتی اور نوکر کو مرغیوں کی خبر گیری کی تلقین کرتی۔

جہلم پہنچ کر وہ سیٹ پر لیٹ گئی۔

''ہائے چکر آنے لگے چکر۔۔۔۔ چکر۔۔۔۔ چکر

چنانچہ بس لیٹ ہو گئی اور مری جانے والی بس نہ مل سکی۔ مجھے مجبوراً ایک دوست کے ہاں رہنا پڑا۔ رات بڑی خوشگوار تھی۔ اور ہوا چل رہی تھی میں اور میرا دوست کمپنی باغ میں سیر کرنے

کے لئے چل دیئے۔ہم نے وہ جگہ دیکھی جہاں قائد ملت لیاقت علی خان کو شہید کیا گیا تھا۔اور وہ لال دیکھا جہاں میرا دوست نقش کھلاتا تھا۔

باغ میں خاموشی تھی۔

اور چاند جیسی روشنی میں چیڑھ کے سائے روشنیوں پر جھول رہے تھے۔ہم ایک جگہ پتھر کے چھوٹے سے چبوترے پر بیٹھ گئے۔وہاں اندھیرا تھا۔اور قریب ہی جھاڑیوں میں جھینگر بول رہے تھے۔

میرا دوست حامد کی طرف دیکھ کر مصر کی سیاہی پوزیشن پر گفت گو کرنے لگا۔اور مجھے آج سے پانچ سات ہزار سال پہلے فرعون کا مصر یاد آگیا۔

:ورکھو پڑا یاد آگئی۔

''میرا دوست کہہ رہا تھا۔

اے شاہ فاروق کیا کرے گا۔

''میں نے سنا ہے ہالی ووڈ جا رہا ہے۔

''وہ کیوں؟

''شاید فلموں میں باپ کا پارٹ ادا کرے گا۔

سڑک پر سے ایک کار چیختی گذری۔

وہ حضرات محکمہ جنگلات سے آج یوم درخت کاری منا رہا ہے۔آپ بھی اس قومی خدمت میں حصہ لیں اور زیادہ سے زیادہ درخت اگائیں۔درخت قوم کا سرمایہ ہیں۔

درخت ہماری دولت ہیں۔

درخت اگائیں اور درخت اگائیں۔

میں نے اپنے دوست کو مشورہ دیا کہ وہ بھی اپنی کوٹھی کے لان میں زیادہ سے زیادہ درخت اگائے۔

پھر ان کی چھاؤں میں بیٹھ کر خدا کو یاد کرے۔

ہم لوگ ایک عرصہ سے خدا کو یاد کر رہے تھے۔

لیکن جو بھی وہ۔۔۔۔۔

میرا دوست اقتصادیات پر باتیں کرتے ہوئے بولا۔

روپے کا دوسرا نام عزت ہے''

''اس کا تیسرا نام کیا ہے؟''

''خدا جانے کیا ہے؟''

میں جانتا ہوں لیکن ان باتوں کو چھوڑو۔چلو گھر چلیں اور درخت اگائیں۔

راولپنڈی سے کوہ مری جانے والی بس میں کافی رش تھا۔بس صبح نو بجے روانہ ہوئی اپر کلاس پوری کی پوری ایک امرتسری کنبے کی تحویل میں تھی۔اس کنبے کا سردار ایک پتلون پوش آدمی تھا جو بے حد باتونی اور گھریلو ٹائپ کا مرد تھا۔عورتوں کی طرح اس کی ہر بات مکان کے دروازے سے شروع ہو کر باورچی خانے میں پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔

کبھی وہ بچوں سے باتیں کرتا۔کبھی عورتوں کے برقعے درست کرنے کو کہتا اور کبھی ڈرائیور سے وقت دریافت کرتا۔پنڈی سے اس نے آم۔آچار نیبو اور بہت کچھ خرید لیا تھا۔اپنی بچی کو مخاطب کر کے اس نے دیگر سواریوں پر اپنا رعب جمانا چاہا۔

''گوگی تمہیں چکر تو نہیں آتے؟

پتہ ہے جب ہم گوہاٹی سے آسام گئے تھے۔

تو کتنے چکر آئے تھے۔یہ تو سفر کچھ بھی نہیں''

چھتر پانچ کر بولا:۔

یہ سب باغ لوکانوں کے ہیں۔پچھلے سال انہیں کا ٹھیکہ لیا تھا۔

کمپنی باغ بس رکی تو وہ بادل دیکھ کر بولا۔

گوگی کی ماں دیکھو یہ بادل ہیں۔ یاد ہے گلگت جاتے ہوئے ہوائی جہاز اس قسم کے بادلوں میں چھپ گیا تھا۔

اس کا چھوٹا لڑکا بولا۔

"پھر ڈرائیور کو رستہ کیوں کر ملا؟"

"بس مل گیا وہ تو رستہ نکال ہی لیتے ہیں۔

"اس نے دوربین لگائی ہوگی؟"

ارے بک بک کیا کر رہے ہو؟

لو اب چائے پیو۔ آڑو کھاؤ گے؟"

چھتر سے اس نے آڑووں کا پورا ٹوکرا لے لیا تھا اور یہ کہتے ہوئے آم کی ٹوکری کے ساتھ رکھ دیا تھا۔

'مری چل کر کھائیں گے۔ رضیہ کی ماں تم نیبو کاٹ کر رکھ لو۔ تمھیں چکر ضرور آئیں گے۔

"آپ کو بھی آئیں گے"

"اری مجھے کبھی چکر نہیں آتے"

ہاں اسے کیسے چکر آ سکتے تھے۔ وہ تو خود چکر تھا۔ ایک چکر۔ کمسن چکر یعنی بڑا چکر!___"

جوں جوں مری قریب آ رہا تھا ہوا میں خنکی پیدا ہو رہی تھی اور بادل بس کی کھڑکیوں کو چھوڑ کر گذر رہے تھے۔ سنی بنک کے پاس پہنچ کر اس گھریلو چکر نے اپنے بیٹے سے پوچھا۔

"لادے: گدھے کی سواری کرو گے یا گھوڑے کی؟"

لادا بولا

میں تو آپ کے کندھوں پر چڑھوں گا ابا۔"

سنی بنک کے قریب اسے بھی چکر آنا شروع ہو گئے اور وہ نڈھال ہو کر نیبو چاٹنے لگا۔

مری میں بہت رونق تھی اور لوگ گرم کپڑوں میں ملبوس مال پر چہل قدمی کر رہے

تھے۔ عورتیں، لڑکیاں، بچے، بوڑھے غرضیکہ ہر انسان میدانوں کی گرمی سے بھاگ کر وہاں اطمینان کا سانس لے رہا تھا اور ان کی گرمی سے ڈھلوانوں پر اگے ہوئے خوب صورت پھولوں کا دم گھٹ رہا تھا۔

بہت سی باتیں جو دو ماہ پہلے تھیں۔ اب نہیں تھیں۔ اپریل میں جن درختوں پر پھول چھوڑ کر چلا آیا تھا۔

وہاں اب کوئی پھول نہ تھا جو زرد پتے بیلوں پر لٹک رہے تھے کہیں گم ہو چکے تھے۔ کھو چکے تھے۔ مری میں کچھ لوگ ذہن لے کر آتے ہیں اور کچھ پیٹ۔ جو پیٹ لے کر آتے ہیں انہیں وہاں دودھ نہیں ملتا۔

گھی اور پیسٹری نہیں ملتی۔

ان کے لیے پانی میں کیڑے ہیں۔

اور دوسرے ہی دن پیٹ کی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اور جو لوگ ذہن لے کر آتے ہیں ان کے لیے ہر درخت سرسبز پھول تر و تازہ اور ہر کلی مہک دیتی ہے۔

پھر مری کا چشمہ ویری ناگ سے آتا ہے اور ہوا گلمرگ کی وادیوں سے گذر کر آتی ہے۔

شام پانچ بجے شاہین ہوٹل میں مری لٹریری لیگ کی طرف سے ادب میں فحاشی کے موضوع پر ایک مباحثہ تھا۔ اس مباحثہ میں وقار عظیم اور عبدالسلام خورشید کے علاوہ اور بھی لوگ شریک تھے۔ جہاں وقار صاحب تشریف فرما تھے۔ ان کے اوپر سمسن اینڈ ڈیلائیلہ کا خوبصورت پوسٹر لگا تھا۔ اور جہاں عبدالسلام خورشید بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے پیسٹری کی پلیٹ اور رشید صاحب کو للچائی نظروں سے تک رہی تھی۔

ادب میں فحاشی ہو یا نہ ہو لیکن شاہین ہوٹل کی چائے میں دودھ بے حد کم تھا۔ مجھے ایکا ایکی گوالمنڈی کی چائے یاد آ گئی جو صرف دودھ میں پکتی ہے اور جس میں زعفران کی مہک ہوتی

ہے اور جس کی خوشبو دور سے کھینچتی ہے۔

رات کو سیروز سینما میں تازنین فلم دیکھی جو تھرڈ ریٹ فلم تھی۔ اس کے مکالمے عزم بازید پوری نے لکھے تھے اور کیا خوب لکھے تھے۔ ایک جگہ مدھو بالا ناصر خان کو کہتی ہے۔

"آؤ گھڑی دو گھڑی کے لئے اس دنیا کو بھول جائیں"

کیا مزے دار مکالمہ ہے۔ ہماری ہر فلم ہمیں یہی پیام دیتی ہے۔ آؤ اس دنیا کو بھول جائیں جہاں لوگ کنوؤں میں چھلانگیں لگاتے ہیں اور ریل کے نیچے سر رکھ دیتے ہیں۔

اسی روز مری میں ایک نوجوان نے بیکاری سے تنگ آ کر اپنا نصف گلا چاقو سے کاٹ لیا تھا۔ واقعی اس دنیا کو بھول جانا چاہیئے۔ اور مدھو بالا کے پاس چلے جانا چاہیے۔"

ایک اور جگہ ہیرو ______ لکھ پتی باپ کا بیٹا شاعری کرتا ہے۔

"آہ! سیما! یہاں چاند ہیں تارے ہیں اور میں ہوں اور تم ہو ___"

آہ! میری محنت پھل لے آئی۔ ہر طرف محبت ہے۔ کسان کی محبت کھیت میں گندم بن کر لہلاتی ہے اور ......

اس کے آگے کچھ اور تھا۔

دراصل ہونا یہ چاہیے تھا۔

اور زمیندار کی محبت اسے کاٹ کر اپنے گھر لے جاتی ہے۔

مری اپنی رونق اور چہل پہل کے اعتبار سے ان دنوں نقطہ عروج پر ہے۔ لیکن یہ رونق اور چہل پہل بس ایک رقص شرر ہونے تک ہوتی ہے۔ ابھی مال پر زرق برق لباس۔ نقرئی قہقہے۔ بھدے اور خوبصورت چہرے امریکی اور پاکستانی سوٹ مصروف گلگشت ہیں۔

جوں ہی بادلوں کا غبار لہرایا۔

ہلکا سا چھینٹا پڑا اور مال ایک دم صاف ہو گئی۔

اور تھرکیلے لباس اور مسکراتے چہرے اور کسی کو ڈھونڈتی ہوئی آنکھیں حرف غلط کی مٹ گئیں۔

بادلوں کے چھٹتے ہی مال

بارش میں بھیگی ہوئی مال

ٹکسال سے نکلے ہوئے سکے کی طرح چمک رہی ہوتی ہے۔

کچھ "رونق" دوکانوں میں گھس جاتی ہے۔

اور کچھ واپس گھروں کو چل دیتی ہے۔ پھر بھی مال کا حسن باقی رہتا ہے۔ اس اکیلی اور لٹکتے ہوئے سرمئی بادلوں کے سائے میں لپٹی ہوئی تھا اور اس مال کا حسن ازلی اور ابدی ہے۔ اسے نہ گرتی ہوئی برف منجمد کر سکتی ہے اور نہ موسلا دھار بارش بہا سکتی ہے۔

مال کا یہ حسن عارضی نہیں ______ ٹکسال سے نکلا ہوا سکہ نہیں خود ٹکسال ہے۔ اور جسے دیکھ کر ناصر کاظمی کا وہ شعر یاد آ جاتا ہے۔

اک صدا سنگ میں تڑپی ہوگی

اک شرر پھول پہ لرزا ہوگا

پچھلے دنوں ہفتے کی شام کو مال کے موسیقی نواز کیفے میں ہوائی ڈانس کا پروگرام تھا۔ یعنی جزیرہ ہوائی کے عوامی رقص پیش کئے گئے۔ امریکہ کے ساتھ ساتھ ہمارے کلچر میں ہوائی اثرات بھی بڑی تیزی سے اپنا رنگ جما رہے ہیں۔ ہماری شاید ہی کوئی فلم ایسی ہوگی جس میں ہوائی ڈانس نہ ہو یعنی بڑی بڑی پھولدار شرٹ پہنے شوخ رنگوں والے لہنگے زیب تن کئے جہاں اور گلے میں پھول سجائے مرد اور عورتیں پاگل مچھروں کی طرح اچھل کود نہ رہے ہوں۔ ہمیں ابھی تک اپنے کلچر کا سراغ نہیں مل سکا۔

ہم ہزار میل کے فاصلے پر آباد ایک جزیرے کو کیا سمجھ سکیں گے۔ امریکی ہوٹل اور امریکی فلمیں اگر ہوائی رقص پیش کرتی ہیں۔ تو وہ حق بجانب ہیں اس لئے کہ امریکن پاکستانی نوجوان جب غیر کے توبرے میں منہ ڈالتے ہیں۔ تو اپنا سامنہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ

مال کے موسیقی نواز کیفے میں ہوائی رقص کا وہی حشر ہوا جس کی ہمیں امید تھی ایک دو ادھیڑ عمر کی عورتیں خطرناک حد تک میک اپ کئے گلے میں سرخ پھولوں کے ہار ڈالے صرف انگلیاں اور رانوں تک لہنگا ڈالے ڈانس پر آئیں۔ اور اپنے جسموں کو اس قدر گھٹیا اور بے حیا انداز میں تھرکانے لگیں۔

کہ ہمیں شرم سی محسوس ہونے لگی۔

عظیم تھا۔ جس نے سب سے پہلے جسم کی عزت کی اور روح یونان کو پہچانا۔

جسم کی عزت کرا کر آدمی ہوائی رقص تو کر سکتا ہے۔

مگر اپنے بدن میں وہ روشنی پیدا نہیں کر سکتا۔ جو کبھی ٹیکسلا اور ایورا کی عبادت گاہوں میں جگمگایا کرتی تھیں۔

جس نے دیا اور ہادی کو TESS دی اور اقبال سے ''پیام مشرق'' لکھوایا۔

بدن کی عزت اور انسان کی عزت کائنات کی عزت ہے۔

میں نہیں جانتا ان عورتوں نے کس ماحول میں پرورش پائی تھی جو ہال میں بیٹھی اس رقص سے لطف اندوز ہو رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں اور تالیاں پیٹ رہی تھیں۔ شاید انہیں امریکہ میں پیدا ہونا چاہیے تھا۔

یہ وہ لوگ ہیں جن کے نیچے ہماری زمین دلدل ہے۔ جو ہماری زمین پر ایک بوجھ ہیں۔''

ہوائی رقص ہیں۔ ہوائی قلعے ہیں

رُت آئے، رُت جائے

برسات کی پہلی جھڑی میں غسل کرنے کے بعد سارا شہر غسل خانہ بن گیا ہے۔

جگہ جگہ پھسلن، کیچڑ اور پانی کے گڑھے نمودار ہو رہے ہیں۔ بارش کے بعد مال دھل کر چمکنے لگتی ہے اور سبزی منڈی کے باہر گھٹنے گھٹنے پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ کوٹھیوں کے خوبصورت لانوں میں آم کے پیڑوں پر جھولے پڑ جاتے ہیں اور شہر کے اندر کوٹھیوں کی چھتیں ٹپکنے لگتی ہیں۔ ہر برسات ہر تہوار، ہمارے طبقاتی تضاد کو عریاں کرنے آتا ہے۔''

برسات کے بعد اس کا موسم شروع ہوتا ہے۔ یہ وہ موسم ہوتا ہے کہ جب دھوپ میں ہرن کی کھال سیاہ پڑ جاتی ہے۔ مال کی دونوں جانب ہرے بھرے درخت گھاس اور پھولوں سے لدے ہوئے پودے لوگوں کو وہاں سے گزرتا دیکھتے ہیں اور لوگ ان کی طرف جلے بجھے سگرٹ، پان کی پیک خالی ڈبیاں پھینک کر گزر جاتے ہیں۔ لیکن پھول سدا مسکراتے ہیں۔

ان سے ان کی مسکراہٹ کوئی چھین نہیں سکتا۔ اور نہ پان کی پیک اور نہ جلا ہوا سگرٹ!

شام کو لارنس میں چہل پہل رہنے لگتی ہے۔ اب تو برقعہ پوش عورتیں بھی گھروں سے باہر نکلنا شروع ہو گئی ہیں۔ اگر وہ اس طرح گھروں سے باہر نکلتی رہیں تو ایک نہ ایک دن برقعوں سے

باہر نکل آئیں گی اور پھر ان کے زرد چہرے بہار کی پہلی ہوا میں شگفتہ ہو جائیں گے۔ اوپن ایرکیفوں میں چائے کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔ اور مال کے ہوٹلوں میں بھی زندگی کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔ شہر کے اندر پان کی دوکانوں اور قہوہ خانوں پر لوگ ریڈیو پر نشر ہونے والی تقریروں کو ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں۔ اور پھر ہمہ تن گوش ہو کر تا کے ریکارڈ کا انتظار شروع کر دیتے ہیں۔ نان کباب اور سوڈا لیمن بیچنے والے اپنے اپنے کام میں مگن رہتے ہیں۔ جب خبریں براڈ کاسٹ ہوتی ہیں تو سوئچ آف کر دیتے ہیں۔ اور ایک دوسرے سے دریافت کرتے ہیں۔

''وہ محفل کا ریکارڈ کب بجے گا؟''

گرمیوں میں یہاں اس قدر گرمی پڑتی ہے اور گرد و غبار اڑتا ہے کہ گرد' گرما' گدا' گورستان ملتان کے تحفے یاد آتے ہیں۔ مال کے علاوہ اس موسم میں دوسری سڑک پر سے گذرتے ہوئے آپ کو محسوس ہوگا جیسے آپ گرد و غبار کے غار میں سے گذر رہے ہیں۔ اور یا گرد و غبار کا غار آپ میں سے گذرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپ لاکھ ہاتھ پاؤں ماریں یہ گرد و غبار آپ میں سے گذر کر ہی رہے گا۔ دراصل یہ شہر بڑا پرانا شہر ہے۔ یہاں کے بازار گلیوں میں اور گلیاں مکانوں کی ڈیوڑھیوں میں جا کر ختم ہوتی ہیں۔ یہاں اکثر گلیوں میں قبریں ہیں۔ یہ پہلا شہر ہے جہاں مردے قبرستان جا کر واپس اپنی گلیوں میں آجاتے ہیں۔ کارپوریشن کا باغ اور دفتر بھی بہت خوبصورت جگہ ہے۔

یہاں تک آتے آتے گرد و غبار اٹھتا اٹھتا بیٹھ جاتا ہے۔ اور جہاں گرد و غبار بیٹھ کر اٹھتا ہے اور اٹھ اٹھ کر اڑتا ہے وہاں سے مس کارپوریشن کبھی نہیں گذرتی۔ اور جب گزرتی ہے تو کار پر ہوتی ہے۔ اور ناک پر رومال ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ برسات کی بارش میں موتی ہوتے ہیں اور یہ زمین کی رگوں میں دوڑنے والا

خون ہوتا ہے۔ لیکن لاہور کی سڑکوں پر یہ موتی گرتے ہی کیچڑ بن جاتے ہیں۔

کھیتوں میں دھان کے خوشے مسکراتے ہیں۔ اور سرکلر روڈ پر مکانوں کے پرنالے رہ رہ کر سڑک پر گرتے ہیں۔ اور گڑھوں میں آن شامل ہوتے ہیں۔ باغوں میں سبزہ لہلہاتا ہے۔ اور گلیوں میں لوگ پھسل پھسل پڑتے ہیں۔

نرگس کے پھولوں کا یہی موسم ہوتا ہے۔ گلاب کے ساتھ نرگس کا بھی ہماری شاعری میں بڑا چرچا رہا ہے۔ میر کی شاعری میں تو نرگس بیمار کا سلگتا ہوا انتظار اور گہری گہری افسردگی بدرجہ اتم موجود ہے نرگس کو اس نے کئی مقامات پر اپنے جذبات کا ترجمان بنایا ہے۔ مثلاً:۔

کاسہ چشم لے کے جوں نرگس
ہم نے دیدار کی گدائی کی

انہی دنوں کافی ہاؤس میں ایک صاحب کو دیکھا کہ نرگس کا پورا گلدستہ کوٹ میں لگائے چلے آرہے ہیں۔ خیال پیدا ہوا کہ آپ کو نرگس سے بے اندازہ عشق ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ عشق تو خیر آپ کو نہیں تھا۔ ویسے آپ گوجرانوالے کے ایک باغبان صاحب زادے تھے۔ مشہور ہے کہ ان دنوں لاہور میں شادیاں بہت ہوتی ہیں۔ شاید اس لئے کہ لوگ اس موسم میں کم کھاتے ہیں۔

دراصل شادی کا مسئلہ ایک خاص اقتصادی مسئلہ بن گیا ہے۔ حسن و عشق کا حلیہ ہی بدل گیا ہے۔ نہ عشق پہچانا جاتا ہے اور نہ حسن۔ سوہنی اگر اس زمانے میں ہوتی تو بھی کچے گھڑے پر دریا پار کرنے کا RISK (رسک) نہ لیتی۔ بلکہ مہینوال کو لاری پر بیٹھ کر دریا کا پل پار کر کے آنا پڑتا۔ اور بہت ممکن ہے سوہنی پھر بھی اسے نہ مل سکتی۔

اسی طرح اگر فرہاد زندہ ہوتا تو وہ اتنی آسانی سے پہاڑ کاٹ دینے پر کبھی آمادہ نہ ہوتا۔ بلکہ کوئی اور تدبیر کرتا اور اگر ہو بھی جاتا تو محض خادمہ کے کہنے پر خودکشی نہ کرتا۔ بلکہ جب تک

اسے خادمہ یہ آکر بتاتی کہ شیریں مرگئی ہے تو غم سے پاگل ہو کر اپنے سر پے کلہاڑا مارنے کی بجائے خادمہ کی کھوپڑی اڑا دیتا۔

اس موسم میں شادیوں کی کثرت دیکھ کر ہمیں اپنے محلے کے ایک نیم پاگل آدمی کا خیال آتا ہے۔ جو ہر گذرنے والے دلہا کے پاس جا کر کہا کرتا تھا۔

''ابھی وقت ہے بھاگ جاؤ''

پچھلے دنوں ہمارے ایک دوست کا بیاہ تھا۔ اس سلسلے میں ہمیں باٹا پور جانا پڑا۔ شادی پر ایک مشہور طوائف کا ناچ گانا بھی ہوا۔ اس محفل خاص میں کئی لوگ مدعو تھے۔ اتفاق سے ایک سودخور پٹھان بھی موجود تھے۔ طوائف نے سب سے آخر میں ایک گیت گایا۔ وہ بڑے قیمتی زیورات میں لدی پھندی لہک لہک کر گا رہی تھی۔

میں بن میں اکیلی پھرتی تھی
اور پھولوں سے دکھڑا کہتی تھی
میں بن میں اکیلی پھرتی تھی

پٹھان صاحب نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ لوگوں نے بہتیرا چپ کرایا لیکن آپ کی گھگھی بندھ گئی۔ گیت ختم ہوا۔ اور جب آپ سے رونے کا سبب پوچھا تو آپ نے ناک پونچھتے ہوئے فرمایا:۔

''ہم اس لئے روتا ہے کہ یہ بائی جی جنگل میں اتنا زیور لئے اکیلا پھرتا تھا میں اس وقت کہاں مرگیا تھا؟''

برسات اس لئے خوش آئند ہوتی ہے کہ اس کے بعد موسم سرما آجاتا ہے۔ برسات کی رت گذر رہی ہے۔ سرما کا آغاز ہو چکا ہے۔ کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس میں خاصی چہل پہل شروع ہو گئی ہے۔ لنڈا بازار میں بھی گرم کپڑوں کا سٹاک آگیا ہے۔ اور لاہور کے انٹلیکچول

اس بازار کی سیر کے لئے دن چن رہے ہیں۔ دھوپ میں پہلے ایسی تیزی اور سختی نہیں رہی بلکہ سردیوں ایسی نرمی اور شگفتگی آگئی ہے۔ شام کو خنکی ہو جاتی ہے۔ اور رات کو کمبل اوڑھنا پڑتا ہے۔ گرمی کی خوشگوار شاموں کو سیر کرنے والے لارنس باغ سے آہستہ آہستہ غائب ہو رہے ہیں۔ اور اب وہاں ٹھنڈے ٹھنڈے اندھیروں میں چڑیا گھر کی طرف سے کبھی کبھی شیر کے دھاڑنے کی ماتمی سی آواز گونج سنائی دے جاتی ہے۔ انار کلی میں رونق بڑھ گئی ہے۔ گرم کپڑا ادھڑا دھڑ بک رہا ہے۔ اور سردیوں کے لئے بڑی تیزی سے خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ کل شام اس بازار میں سے گذرنے کا اتفاق ہوا تو ایک جگہ ایک بوڑھا نقلی مونچھیں بیچتا دکھائی دیا۔ مونچھیں ہر سائز کی تھیں اور دھاگے کے ساتھ لٹک رہی تھیں۔ میں نے جب قیمت پوچھی تو بوڑھے نے کہا:۔

''پہلے پسند کر لیجیے۔''

پسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ جب مجھے کوئی مونچھ پسند نہ آئی تو بوڑھے نے اپنی مونچھیں اتارتے ہوئے کہا:۔

''ان کے متعلق کیا خیال ہے''

میں نے بوڑھے کی داڑھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:۔

''اس کے متعلق کیا خیال ہے؟''

اس پر بوڑھا ہنس پڑا:۔

''یہ تو اصلی ہے جناب''

چوک میں ایک جگہ فوٹو گرافر کیمرے سے پر سیاہ پردے گرائے پردہ پوشی میں اپنے گاہک کی تصویر اتار رہا تھا۔ گاہک دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے یوں سینہ پھلائے بیٹھا تھا جیسے اس میں ہوا بھر دی گئی ہو۔ اس کی آنکھیں پوری کھلی تھیں اور ٹوپی کا پھندنا غائب تھا۔ (یہاں اکثر ایسا

ہوتا ہے جو لوگ ٹوپیاں پہنتے ہیں ان کے پھندنے غائب ہوتے ہیں اور جو پھندنے پہنتے ہیں ان کے نیچے سے ٹوپیاں غائب ہوتی ہیں)۔

کیمرے کے اندر سے آواز آئی:۔

''ریڈی! وَن ______ ٹو ______ تھری!''

اور تصویر اتر گئی اور جب گاہک کو دھلا دھلا کر دکھائی گئی تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

''یہ میری تصویر نہیں ہے''

فوٹوگرافر نے تنک کر کہا:۔

''میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ یہ آپ ہی کی ہے۔''

''آپ لکھ کر بھی دیں جب بھی یہ تصویر میری نہیں ہوگی۔''

بعد میں پتہ چلا کہ جب تصویر اترنے والی تھی تو ایک صاحب پگڑی باندھے گاہک اور کیمرے کے درمیان سے گذر گئے تھے۔

ان دنوں جو صاحب بسم اللہ ہوٹل میں ریکارڈ لگانے پر مامور ہیں۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ آپ کا قد چھوٹا۔ جسم موٹا اور آنکھیں سرخ رہتی ہیں۔ آپ فلم میں کام کرنے سیالکوٹ سے لاہور آئے تھے مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ اچھے بھلے ریکارڈ بجاتے بجاتے آپ پر ایکا ایکی فلم کا دورہ پڑتا ہے۔ اور دوسرے ملازم کی طرف خوفناک آنکھوں سے تکتے ہوئے آپ جبڑے پھیلاتے ہیں۔ اور چندر موہن کی طرح ڈائیلاگ بولنے لگتے ہیں:۔

''میں راج کماری سے پریم کرتا ہوں۔ میں تمہارے ارمانوں کا گلا دبا دوں گا۔ اس حرام زادی سے بھی کہہ دو کہ اپنے ارمانوں کو (لکا چھپا) لے۔

آپ ہر گاہک سے دیوانند کا پوز بنا کر بات کرتے ہیں۔

موسم سرما لاہور کا بہترین موسم ہوتا ہے۔

ان دنوں لارنس میں چاندنی راتوں پر کسی آسمانی دوشیزہ کا گمان ہوتا ہے۔ جب شام ڈوب جاتی ہے اور شملہ پہاڑی کی اوٹ میں سے یوکلپٹس کے لمبے لمبے درختوں پر چاند نمودار ہوتا ہے۔ تو باغوں کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ اور درختوں کے بیچوں گذرنے والی چھوٹی چھوٹی سڑکوں کی تنہائیاں چمکنے لگتی ہیں۔ اس سے بے اختیار ناصر کاظمی کا یہ شعر لب پر آ جاتا ہے۔

چاند نکلا تو ہم نے وحشت میں
جس کو دیکھا اسی کو چوم لیا

اس وقت نہ صرف یہ شعر آ جاتا ہے۔ بلکہ اس شعر پر عمل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن جب چاند نکلا ہے تو لوگ بہت کم گھروں سے باہر نکلتے ہیں۔ اور اگر کہیں کوئی صورت بھی نظر آ جاتی ہے تو صورت حال ایسی ہوتی ہے کہ آدمی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس وقت یہی جی چاہتا ہے کہ کاش چاند کبھی نہ نکلتا۔ یا پھر ہم گھر سے نہ نکلتے۔ یا پھر ناصر کاظمی ہی کہیں سے نکل آتا کہ اپنی وحشت اسی پر ہی نکال لی جاتی۔

آج سے تقریباً پانچ چھ سو برس پہلے چین میں ایک شاعر ہو گزرا ہے۔ جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ چاند سے والہانہ پیار کرتا تھا۔ چنانچہ اس کی موت بھی اسی پیار کی وجہ سے ہوئی۔ کہتے ہیں کہ ایک دن وہ چاولوں کی شراب پیئے دریا کی سیر کر رہا تھا۔ کہ بانس کے جھنڈوں میں سے چاند طلوع ہوا اور اس کا عکس دریا میں جھلملانے لگا۔ شاعر نے عکس دیکھا اور صرف یہ شعر پڑھ کر دریا میں چھلانگ لگا دی:۔

''میں اس سے ملنے جا رہا ہوں
میں پھر کبھی نہیں آؤں گا''

یہ بات ابھی تک واضح نہیں ہو سکی کہ اس کو چاند نے بلایا تھا یا نہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ واپس نہیں آ سکا۔ اگر وہ شاعر اس زمانے میں زندہ ہوتا تو امریکہ سے چاند کی طرف

جانے والے راکٹ میں اپنی سیٹ بک کروا لیتا۔اور جب چاند کے سفر سے واپس آتا تو صرف ایک شعر کہتا:۔

''میں چاند سے مل کر آرہا ہوں
میں چاند سے ملنے پھر کبھی نہ جاؤں گا''

لاہور کا ایک غزل گو بھی چاند سے والہانہ پیار کرتا ہے۔چاندنی راتوں میں وہ چکور کی طرح چڑیا گھر کے آس پاس منڈلاتا رہتا ہے اور چاند کو دیکھ کر کیدار میں اپنے شعر گنگنایا کرتا ہے۔

اور جب راتیں چاندنی نہیں ہوتیں تو موم بتی جلا کر کمرے میں بیٹھ جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے۔

''چاند کس شہر میں اترا ہو گا''

میں اس کے دوستوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ اسے چاندنی راتوں میں دریا کا رخ نہ کرنے دیں کیوں کہ اگر اس نے چاند کی محبت میں بے تاب ہو کر دریا میں چھلانگ لگا دی تو بہت برا ہو گا کیونکہ اس شاعر کو تیرنا آتا ہے۔چنانچہ تھوڑی دیر بعد وہ پھر دریا کے کنارے کھڑا ہو گا۔

اس خوش گوار موسم میں مجھے لائل پور جانے کا اتفاق ہوا۔

لائل پور کا علاقہ آباد ہونے سے پہلے گنجی بار کا علاقہ کہلاتا تھا۔میرے خیال میں اگر آج بھی اس علاقہ کو گنجی بار کے رومانی لقب سے یاد کیا جائے تو فرق نہیں پڑے گا۔اگرچہ لائل پور میں شاذ ہی کوئی گنجا ملے گا۔لیکن گنجے پن کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔دراصل لاہور میں بھی ذہنی گنجہ پن عام ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اس علاقے کا نام کبھی گنجی بار نہ تھا۔واپسی پر آخری بس نکل گئی۔ریل کافی رات گئے چھوٹتی تھی۔لاہور پہنچنا۔بڑا ضروری تھا۔ایک گڈز ٹرانسپورٹ کے ٹرک میں جگہ مل گئی۔اور میں ٹرک میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ٹرک کے چلنے کا انتظار کرنے لگا۔سامنے کھڑے ایک ٹرک پر کچھ بکرے لادے جا رہے تھے۔

ایک بکرا مسلسل تھوڑا تھوڑا پیشاب کر رہا تھا۔کلینر نے اپنے ڈرائیور کو اطلاع دی:۔

''بھاجی! اس بکرے کی ٹینکی لیک کر رہی ہے۔''

لاہور تک ڈرائیور سے باتیں ہوتی رہیں اور دونوں ایک دوسرے سے خوب بور ہوئے۔

سیاسیات پر گفتگو چھڑی اور مصر کا ذکر آیا تو لاہوری ڈرائیور نے چڑھائی پر گیئر بدلتے ہوئے کہا:۔

''ہم تو یہ جانتے ہیں کہ مصر کا علی بابا چلا گیا ہے اور چالیس چور چھوڑ گیا ہے۔''

''کیا مطلب''

''مطلب یہ کہ مصر کا پٹرول بھی ختم ہو رہا تھا۔''

شاہدرہ پہنچ کر پتہ چلا کہ ٹرک کا پٹرول بھی ختم ہو رہا تھا۔''

سردیاں بیت رہی تھیں کہ ایک ہائی سکول کی ڈرامائی کلب نے اپنے سکول کے آنگن میں ''سلطان صلاح الدین'' ڈرامہ کھیلا۔جس وقت ہم لوگ آنگن میں پہنچے۔سلطان صلاح الدین اپنے وزیر خاص سے یروشلم کی دفاعی پوزیشن کے بارے میں بات چیت کر رہا تھا۔

پردا گرا اور بچوں کی قطار نے سٹیج پر آ کر گانا شروع کر دیا:۔

چل جہاں کے مارے نہ ہوں
جھوٹی آشا کے تارے نہ ہوں

اس ڈرامے کا آخری منظر بہت ہی دلچسپ تھا۔رچرڈ شکست کھا چکا ہے وہ ایک پہاڑی کے دامن میں کھڑا ہے اس کا وزیر اس سے پوچھتا ہے:۔

''حضور اب یروشلم کی زیارت کب ہو گی؟''

رچرڈ زور سے ماتھے پر ہاتھ مارتا ہے اور گانا شروع کر دیتا ہے:۔

ان حسرتوں کو کہہ دو کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دل داغ دار میں

جنوری کے وسط میں موسم سرما رخصتی کی تیاری مکمل کر لیتا ہے اور گرمیوں کا سورج اپنے پر پرزے نکالنے شروع کر دیتا ہے۔ فروری مارچ کے مہینے بہار کے مہینے تصور کئے جاتے ہیں۔ انہی ایام میں دھرتی اپنے سینے میں چھپائے ہوئے سارے رنگ۔۔ گھاس' پتوں اور پھولوں میں بانٹ دیتی ہے۔ دم صبح ہواؤں میں مہک بسی ہوتی ہے اور سرشام مشرق کی جانب لوٹتی ہوائیں اپنے ساتھ بازاروں گلی کوچوں کا شور اور کھلے آسمان تلے گھر کے آنگنوں میں کھیلتے بچوں کی آوازیں بھی لے جاتی ہیں۔ یہ دو مہینے بارہ مہینوں کا عرق ہیں یہ وہ مہینے ہیں جو پورے سال کے کیلنڈر پر ہرے بھرے جزیروں کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ ان جزیروں میں کہیں اناس کے باغ ہیں' کہیں چنبہ کے جھنڈ ہیں اور کہیں آم کے پیڑ ہیں۔

میرا لاہور

کسی باذوق آدمی نے لاہور کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا:۔

''لاہور لاہور ہی ہے''

اگر آپ کبھی لاہور آئیں اور اس لاہور کی سیر کرنا چاہیں تو یہ لاہور آپ کو مال' میکلوڈ لارنس' چیرنگ کراس' زمزمہ ٹمپل روڈ بیڈن روڈ' میسٹر ڈارجن ٹمٹا اور کافی ہاؤس میں نہیں ملے گا۔ اس سے ملنے کے لئے آپ کو میکلوڈ روڈ کا دریا عبور کر کے جھکے جھکے چھجوں والی تنگ و پیچدار گلی کوچوں۔ بینگے ٹیڑھے بازاروں۔ بڑ کی ٹھنڈی چھاؤں میں سوئے ہوئے مزاروں۔ تکیوں اور شاہی کبابوں کی دھواں کھائی دوکانوں پر جانا پڑے گا۔ مال اور میکلوڈ کے لاہور میں آپ کو ہر آدمی وقت کے تعاقب میں بھاگتا ہوا' دوڑتا ہوا ملے گا جیسے وہ ان کی جیب کاٹ کر لے گیا ہو لیکن انارکلی' شالامار' شاہدرہ' موچی گیٹ اور گوالمنڈی کے لاہور میں آپ ''وقت'' کو سگرٹ منہ میں دبائے' دونوں ٹانگیں میز پر رکھے بڑے آرام سے کرسی پر نیم دراز پائیں گے۔ یہ لاہور نئے لاہور سے بڑا مختلف ہے۔ نیا لاہور اگر ٹکسال سے نکلا ہوا نیا سکہ ہے تو پرانا لاہور کسی مغل شہنشاہ کے تاج سے گرا ہوا عقیق ہے۔ آموں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی وہ بارہ دری ہے جس کے سفید پتھروں پر سیاحوں نے پر محبت اشعار لکھے ہوں۔

اس لاہور کا ایک اپنا کلچر ہے اپنی زبان ہے اپنی رسمیں ہیں۔اپنے میلے ٹھیلے ہیں۔اپنی خوشیاں اور اپنے غم ہیں۔میں آپ کو اس لاہور کے ہوٹلوں قہوہ خانوں اور تہواروں کی ایک ہلکی سی جھلک دکھانا چاہتا ہوں۔سیر کرانا چاہتا ہوں۔اسلیئے نہیں کہ میرا لاہور ہے۔مجھے اس کی تمام کمزوریوں کے باوجود اس سے محبت ہے' پیار رہے گا۔پچھلی بسنت کا حال سُنئے:۔

صبح بسنت تھی اور کنکوئے بیچنے والوں کی دوکانوں پر سرشام ہی یار لوگوں نے میلہ سا جمار کھا تھا۔پتنگیں سدھ کی جارہی تھیں۔ڈور چرکھڑیوں کا معائنہ ہو رہا تھا مکانوں کی چھتوں پر بسنت کے روز ریکارڈ بجانے اور شور مچانے کے لئے گلے کی رگوں اور پٹھوں پر گھی کی مالشیں ہو رہی تھیں۔رات گئے تک یہ شغل جاری ہے اگلے روز منہ اندھیرے ہی پتنگوں کے شائقین چھتوں پر آن حاضر ہوئے۔اور مائیکروفون پر اپنے حریف کھلاڑیوں کو صلائے عام کا پیغام دینے لگے:۔

''چل بھئی گامی! نکل آ ذرا لحاف سے باہر''

''خلیفہ کبابیا جہاں کہیں ہے ہوشیار ہو جائے۔خبردار ہو جائے''

ادھر گامی نے بھی لحاف سے نکل کر ایک چھلانگ لگائی اور کوٹھے پر آ کر ڈھول پیٹنا شروع کر دیا:۔

''آ گئے ہیں۔۔۔آ گئے ہیں شیر میدان میں۔گیدڑ چھپ جائیں۔''

لیکن شیروں کے ساتھ گیدڑ بھی ڈٹے رہے۔جمے رہے اور دن بھر پیچ لڑتے رہے۔پتنگیں کٹتی رہیں اور پھر اڑتی رہیں۔ہماری ٹولی نے چل پھر کر' پہلے مزنگ' پھر انارکلی اور پھر گوالمنڈی میں پیچ لڑائے اور پیچ دیکھے ہمارے سامنے ایک لڑکا تیسری منزل سے گرا اور اسے اسی وقت ہسپتال پہنچا دیا گیا۔چوک برف خانہ میں دو پارٹیوں میں پیچ پیچ کی جنگ چھڑ گئی جو زخمی ہوتا اسے ہسپتال پہنچا دیا جاتا اور جو ہسپتال چلا جاتا' اس کی جگہ کوئی دوسرا سنبھال لیتا۔کنکوں کے پیچ پر بڑی بڑی شرطیں لگائی گئیں۔ایک پہلوان نے اپنے کاغانی دنبے کی

شرط لگا دی۔بدقسمتی سے وہ شرط ہار گیا۔دنبے کی رسی اپنے حریف کے ہاتھ میں دیتے وقت پہلوان کی آنکھیں بھر آئیں۔اس دنبے کے سر پر محبت سے الوداعی ہاتھ پھیرا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا:۔

''او بلیڈی! مہروں کے ہاتھ سے نکل کر بوچڑوں کے گھر جا رہا ہے میرے دلیپ کمار تیرا خدا حافظ۔گھاس کھاتے وقت پہلوان کو بھی یاد کر لینا۔''

خلیفہ جی! اسے اپنا بیٹا سمجھ کر رکھنا۔نہار کلیجے آملے کا مربہ سونے کے ورق میں لپیٹ کر ضرور کھلاتے رہنا۔جس کھیل میں مس ککو نے کام کیا ہوا سے ضرور دکھلانا۔ککو اسے بہت پسند ہے۔دن میں ایک دفعہ ''لکس'' صابن سے غسل کرانا مت بھولنا۔اچھا اب الوداع میرے آوارہ گرو راجکمار! میرے ''جنٹر مین'' دلیپ کمار!!''

دو پتنگوں کا ایک شاندار پیچ بڑی دور سے آ رہا تھا۔بھاٹی دروازے کے اوپر آ کر ایک پتنگ کو جھول سا پڑ گیا اور اس قدر نیچے جھک آئی کہ وہ ایک بار اس کا پیندا مکانوں کی منڈیروں سے ٹکرا گیا۔تیسری بار جب وہ نیچے آئی تو کسی ستم ظریف نے مٹی پر اچک کر اسے پکڑ لیا۔پکڑنے کے بعد اس نے پتنگ کاٹ کر رکھ لی اور ڈور کے ساتھ اکنی والا کنکوا باندھ دیا اور اسے بڑے آرام سے ہوا میں چھوڑ دیا۔پیچ اس طرح آگے بڑھنا شروع ہو گیا۔میرے خیال میں پیچ لگانے والا پہلے تو کتنی دیر تک اس کایا پلٹ کو سمجھ نہ سکا ہو گا اور پھر جب اسے یقین آ گیا ہو گا کہ جو پتنگ اس نے اڑائی تھی وہ دراصل پتنگ نہیں تھی بلکہ اکنی والا کنکوا تھا تو ایک بار تو اس کے پاؤں تلے چھت کھسک گئی ہو گی۔

ایک اور صاحب نے جو بجلی کے مستری تھے اپنے کوٹھے پر بجلی کی چھوٹی سی موٹر لگا رکھی تھی۔جس وقت ان کی کوئی پتنگ وغیرہ کٹ جاتی تو ڈور کو ہاتھوں سے کھینچنے کی بجائے وہ اس کا سرا موٹر پر چڑھی ہوئی چرکھڑی کے ساتھ باندھ کر موٹر سٹارٹ کر دیتے۔بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ساری ڈور چرکھڑی پر لپٹ جاتی۔راہ میں جو کوئی بھی اس لہراتی دودھاری تلوار کو

پکڑنے کی کوشش کرتا انگلیاں لہولہان کر لیتا۔ علاوہ بریں بعض صاحب دمڑی کی گڈی چھوڑ کر کسی نہ کسی سے خواہ مخواہ پیچ لڑا دیتے اور برقی موٹر کے سہارے طوفانی کھینچا کھینچی کے بعد حریف کی ساری ڈور اور پتنگ لپیٹ کر لے آتے تھے۔

پتنگ بازوں میں بعض باذوق حضرات بھی تھے۔ انہوں نے اپنی اپنی پتنگوں پر عبارتیں اور اشعار لکھ رکھے تھے۔ ہم نے جو پہلی پتنگ لوٹی اس پر "خطرہ گیارہ ہزار وولٹ" لکھا تھا اور کھوپڑی اور ہڈیوں کے نشان بھی تھے۔ دوسری پتنگ پر لکھا تھا:۔

"مت لوٹو! ظالمو! مجھ پناہ گیر کو مت لوٹو۔"

ایک سہ رنگی پتنگ کی عبارت

"ایک شریف لڑکی کو چھیڑتے شرم نہیں آتی؟"

ایک سیاہ رنگ کا کنکوا یہ شعر لئے ہوئے تھا۔

"رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نے پا ہے رکاب میں"

ایک ننھی منھی پتنگ پر لکھا تھا:۔

"قطار باندھ کر لوٹیے"

ہم نے بھی ایک پتنگ پر جلی حروف سے لکھ دیا:۔

"مجھے لوٹنے والا تین دن کے اندر اندر گنجا ہو جائے گا۔"

تھوڑی ہی دیر بعد وہ پتنگ کٹ گئی۔ اس بات کو تیسرا مہینہ جا رہا ہے اس دوران میں کئی ایسے اصحاب سے ملاقات ہوئی جن کے سروں پر ایک بال بھی نہ تھا لیکن افسوس کسی نے پتنگ لوٹنے کا اعتراف نہیں کیا حالانکہ اگر وہ اعتراف کر لیتے تو ہم ان کا بال تک بیکا نہ کر سکتے تھے۔

لندن کے ایک پرانے ہفتہ وار رسالے "ٹٹ بٹس" کے متعلق مشہور ہے کہ شروع شروع میں

یہ پرچہ بے حد کم بکتا تھا۔ ایڈیٹر نے پرچے کو مقبول بنانے کے لاکھ جتن کئے لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ بالآخر اس نے ایک ترکیب نکالی۔ کچھ گدھے کرائے پر لے کر ان کی دونوں جانب چھوٹے چھوٹے بورڈ لٹکا دیئے جن پر موٹے لفظوں میں لکھا تھا:۔

ہم ٹٹ بٹس نہیں پڑھتے ہیں۔"

یہ جلوس سارا دن لندن کے گلی کوچوں میں چکر لگاتا رہا اس کا اثر اتنا ہوا کہ گدھوں کے علاوہ لندن کا ہر شخص وہ رسالہ پڑھنے لگا۔ پچھلے دنوں شہر کی ایک پرانی اور گنجان کڑی میں پنجابی کے دو غیر معروف رسالوں کی آپس میں ٹھن گئی۔ ایک پرچے کے ایڈیٹر نے کیا کیا کہ گدھوں کا ایک جلوس نکال دیا۔ ان گدھوں پر جو اشتہار چسپاں تھے ان پر لکھا تھا:۔

"ہم ہر مہینے رسالہ "چانن" پڑھتے ہیں۔"

پنجابی شعرا کی یہ نوک جھونک بڑی دل چسپ ہوئی ہے۔ مشاعروں کے موسم میں شہر کے گلی کوچوں کی دیواروں پر اکثر ایسے اشتہار دکھائی دے جاتے ہیں جن کے ذریعے کسی دوسرے پنجابی شاعر پر الزام لگایا ہوتا ہے کہ وہ فلاں شاعر سے نظمیں لکھواتا ہے اور وہ پاکستان بننے سے پہلے امرتسر میں شہتوت یا شکر قندی بیچا کرتا تھا۔

دیر کی بات ہے منٹو پارک میں یونس پہلوان اور کالا پہلوان کی کشتی ہوئی۔ دنگل ابھی شروع ہوا ہی تھا کہ پہلوانوں کی ٹولیوں میں کسی بات پر تو تو میں میں ہو گئی اور ایک دوسرا دنگل شروع ہو گیا۔ پولیس بے چاری کو ایک ناگہانی بلا کی مطلق توقع نہ تھی۔ اس نے بہتیرا امن کرنے کی کوشش کی لیکن دس دس روپے کا ٹکٹ خرید کر آئے ہوئے لوگوں نے ہلڑ مچا دیا۔ باہر سے لوگ دو دو روپے والی پہلی کلاس میں گھس آئے۔ درجہ اول کرسیوں پر کھڑا ہو گیا۔ درجہ دوم نے درجہ اول کے کندھوں پر چڑھنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ درجہ اول کرسیاں توڑنے لگا۔ ایک پہلوان کو بیٹھے بیٹھے جانے کیا خیال آیا کہ اچانک کرسی سے اٹھے، زور سے مکا مارا کرسی کے دو ٹکڑے کئے اور چادر جھاڑ کر ایک طرف چل دیئے۔ ایک لڑکا اور کچھ

کرسیاں پبلک میں ہی کہیں گم ہوگئیں۔اکھاڑے کے باہر دنگل کے ٹھیکیداروں کو تھامے بیٹھے تھے اور ایک جوان قریب سے گذرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا:۔

''ٹکٹوں پر بیس روپے اٹھے تھے اور میں نے تین کرسیاں توڑی ہیں۔میرا خیال ہے حساب برابر ہوگیا ہوگا۔''

اس کے ساتھی نے ذرا سوچ کر جواب دیا:۔

''میرا خیال ہے ہوگیا ہوگا کرسیاں بھی تو بید کی تھیں۔''

''ہاں ہاں___اور کافی خستہ تھیں ایک مکا مارو اور کئی ٹکڑے ہو جاتے تھے''

آپ نے دنگل کا تماشا دیکھ لیا۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر دنگل میں ایسا ہوتا ہے اور لاہور کو کشتی لڑنے کا سلیقہ نہیں آتا۔ایسا تو کبھی کبھار ہی ہوتا ہے اور پھر یہ تو لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ ہے۔

اب چلئے بٹیروں کی لڑائی کا تماشا دیکھا جائے۔اودھ کے نواب گان کی بٹیر بازیوں کے احوال تو آپ نے بہت سنے ہوں گے۔آیئے تکیہ موتی شاہ میں خون کو بھی بٹیروں کے روپ میں برسرِ پیکار دیکھا جائے یہ جمعرات کی شام کی بات ہے تکیہ موتی شاہ بڑے بڑے نامی گرامی بٹیرے اور بٹیر باز جمع تھے۔راقم الحروف کے سامنے کئی کئی شرطیں ہاری اور جیتی گئیں۔ایک استاد نے جب اپنا بٹیرا ہرتا ہوا دیکھا تو وہ اسے اٹھا کر تکیے کی کوٹھری میں لے گیا اور دو قطرے برانڈی پلا کر پھر میدان میں لے آیا۔وہی بٹیرا جو تھوڑی دیر پہلے سر چھپانے کو جگہ ڈھونڈ رہا تھا اب سینہ پھلائے گردن اکڑائے کھڑا تھا اور شدت جوش سے کانپ رہا تھا اور جب وہ بھوکے شیر کی طرح اپنے حریف پر جھپٹا تو مخالف گروپ سے ایک بوڑھا بٹیر باز چلا اٹھا۔

''یہ تو سربازی ہے۔بٹیرے کو 'دکسی' (دکی) پلائی گئی ہے۔''

اس اثناء میں بٹیرا صاحب نشے میں دھت ہو چکے تھے اور بدمستی کے عالم میں الٹ بازیاں

لگا رہے تھے۔منصف ایک دم غرایا:۔

''پکڑ لو اس الٹ بازی گر کے پتر کو۔اس نے بری شئے پی رکھی ہے۔''

مگر میرا بٹیرا شراب پی کر شیر ہوگیا تھا اور کسی کے ہاتھ نہ آتا تھا جب اسے بصد مشکل قابو میں کیا گیا تو اس کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں۔گردن جھوم رہی ہے اور اپنے مالک کی جانب یوں تک رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

کار' تانگہ' سائیکل بس اور ٹرک کے علاوہ اس لاہور میں ایک اور قسم کی سواری بھی بڑی عام ہے۔اس سواری کو ریڑا کہتے ہیں اس پر گھاس پھونس بھی لادا جاتا ہے اور بچے اور عورتیں بھی۔کبھی کبھی ان کی آپس میں ریس بھی ہوتی ہے۔پچھلے ماہ ملتان روڈ پر مجھے بھی ایک ریس دیکھنے کا اتفاق ہوا۔یہ ریس سنت نگر اور راجگوہ کے ریڑوں کے درمیان تھی اور ایک ایک ہزار روپیہ شرط لگی تھی۔اس دوڑ میں غیر مشروط طور پر موچی' بھاٹی' ٹکسالی اور گوالمنڈی کے گھوڑوں نے بھی حصہ لیا تھا۔اتوار کی صبح کو منہ اندھیرے ہی ہم لوگ اپنے محلے کے ریڑے پر بیٹھ کر پنچولی سٹوڈیوز کی طرف روانہ ہوگئے ابھی پو پھٹ ہی رہی تھی اور سردی کافی ہو رہی تھی۔جس وقت ہمارا خوبصورت سفید گھوڑا گھنگھروں کی تال پر گردن ہنس کی مانند بلند کئے سنسان پر سے گذرا تو اوپر گنجان درختوں کے درمیان گجردم کی ہلکی نیلی روشنی جھلملانے لگی۔اپر مال اور کنال بینک پر کوٹھیوں کے دریچے نہر بہ لب تھے اور درختوں کے تنے دھند میں ڈوبے ہوئے تھے ہمارے ریڑے پر کمبل اوڑھ کر بیٹھے ہوئے نکے پہلوان نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہا:۔

''یا مولا کسی نیک کا منہ دکھانا صبح صبح''

اور ریڑے پر بیٹھا ہوا ہر آدمی اس کی طرف دیکھنے لگا۔اسد علی نانبائی نے موج میں آ کر

گھوڑے کی ٹاپ سے تال کا کام لیتے ہوئے گانا شروع کر دیا:۔

تیری گھوڑی کو لاگا چور مسافر جاگ ذرا

شا قصائی ایک دم چیخ اٹھا:۔

''چپ کرا دے مسافر دیا پترا''

لیکن مسافر کا بیٹا بدستور گاتا رہا۔ دوسری طرف جاوا حلوائی بھینسے ایسی گردن ہلا کر حاجی امرت سری کو کہہ رہا تھا:۔

''اگر میں کس ملک کا بادشاہ ہو جاؤں تو تلوار پکڑ کر گجا گجا گج سب لوگوں کا صفایا کر دوں۔''

حاجی امرت سری نے تعجب سے پوچھا:۔

''ان کا قصور حضور''

''بس نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری''

ریڑوں کی دوڑ شاہ نور سٹوڈیوز کے نزدیک ایک ایسی جگہ سے ٹھیک پانچ بجے شروع ہوئی۔ منصفین دونوں ریڑوں کو ایک ساتھ کھڑا کر کے آس پاس کھڑے ہو گئے انہوں نے ایک دو تین کہہ کر گھوڑوں کو ہنٹر لگائے اور منہ زور جانور ہوا سے باتیں کرنے لگے ان کے پیچھے دوسرے ریڑے ایک کار اور ایک ٹرک بھی روانہ ہو گیا لیکن انہیں آگے نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ ہمارا کوچوان بڑی مشکل سے گھوڑے کو قابو میں کیے ہوئے تھا۔ بھی ریڑے بے تحاشا بھاگے جا رہے تھے۔ راہ میں اگر کسی جگہ کوئی ریڑا گر پڑتا تو اپنے اوپر ایک اور ریڑا بھی الٹا لیتا۔ دس منٹ کے اندر اندر سنت نگر کا گھوڑا پنچولی سٹوڈیوز والی نہر پر تھا۔ لوگوں نے اس گھوڑے کے گلے میں اس قدر ہار ڈالے کہ اس کی گردن لد گئی۔ اس کے بعد وہاں خوب محفل جمی۔ لوگ دہی کے کونڈے قلچے، روغنی روٹیاں اور پکے ہوئے سری پائے وغیرہ بہت کچھ ساتھ لائے تھے۔ نو بجے نہر کنارے بڑا موج میلہ رہا۔ گھوڑوں پر لمبی لمبی سیریں کی

گئیں۔ ایک پہلوان نے لنگوٹ کس کر دھڑام سے نہر میں چھلانگ لگا دی۔ حاجی صاحب نے دور سے خبردار کیا۔

''پہلوان اس نہر میں نہانا منع ہے''

لیکن پہلوان دریائی گینڈے کی طرح نہر میں اس بری طرح اچھل کود مچا رہے تھے کہ ننھی ننھی لہریں ان سے ڈر کر دور بھاگ گئی تھیں۔ دوسری جانب شیشم کے پیڑ تلے ہارا ہوا کوچوان اپنے مالک کے پاس بیٹھا لسی میں قلچہ ڈبو کر کھا رہا تھا اور ساتھ کہے جا رہا تھا گھوڑا ہر گیا تو کیا ہوا۔ جانور کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے اگلی دفعہ آپ دوڑیں۔

چوک گوالمنڈی کے دو مشہور ہوٹل بالکل آمنے سامنے واقع ہیں۔ ان میں سے ایک بھی ہوٹل ایسا نہیں جہاں بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے آپ کے ذہن میں فرانسیسی ناولوں میں پڑھے ہوئے پیرس کے ہوٹلوں کی یاد تازہ ہو جائے۔ ہاں زعفران سے مہکی ہوئی چاء کی پیالی پیتے ہوئے حافظ کے اشعار ضرور ذہن میں پھولوں کی طرح شگفتہ ہو جاتے ہیں۔ ان دنوں ہوٹلوں کے کاروبار کا انحصار زیادہ تر گراموفون ریکارڈنگ پر ہے آپ اگر یہاں سے گذریں تو آپ کو نئی، تازہ، پرانی اور زیر تکمیل فلموں کے ریکارڈ ضرور سنائی دیں گے۔ یہاں پاکستان کے کونے کونے سے نئے اور تازہ ریکارڈ منگوائے جاتے ہیں اور ہر قیمت پر منگوائے جاتے ہیں۔ پہلے ہوٹل کی پیشانی پر جو بڑا سا بورڈ لگا ہے اس پر ایک عورت شراب کی بوتل لئے رقص کر رہی ہے اور زمین پر ایک عمر خیال ٹائپ کا آدمی ڈبل روٹ شراب میں بھگو بھگو کر کھا رہا ہے۔ جب کوئی گاہک اس ہوٹل میں داخل ہونے کا رخ کرتا ہے تو دوسرے ہوٹل کا مالک ریکارڈ شروع کر دیتا ہے۔

او جانے والے بالمو!
لوٹ کے آ لوٹ کے آ!

جب بالمو الوٹ کر اس ہوٹل کی جانب رجوع کرتا ہے تو دوسرے ہوٹل کا مالک جھٹ اپنے

ریکارڈ پر ساؤنڈ بکس رکھ دیتا ہے اور لتا کی آواز بلند ہوتی ہے۔

بلما بڑا ناادان رے!

بلما بڑا ناادان رے!

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گاہک چوک کے وسط میں کھڑے ہو کر دونوں طرف کی ریکارڈنگ سے لطف اندوز ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ انہی ہوٹلوں میں سے ایک ہوٹل میں ہمارے ایک ان پڑھ دوست بیٹھا کرتے ہیں۔ آپ کے جسم میں طاقت ضرورت سے زیادہ بھری ہوئی ہے چنانچہ آپ ہر وقت کسی نہ کسی سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ آپ کو لڑائی۔ مار کٹائی کی فلمیں بہت پسند ہیں اور بات بات پر منہ سے پستول چلایا کرتے ہیں۔

ڈزن ______ ڈزن ______

کچھ روز ہوئے اندرون شہر کی ایک گلی میں سے بارات گذر رہی تھی کہ آتشبازی کی ایک دوکان پر اتفاق سے بارود کی پوٹلی پھٹ گئی۔ یار لوگوں نے یہ افواہ اڑا دی کہ دلہن پر بم پھینکا گیا ہے۔ ہمارے یہی دوست کو اس حادثے کی خبر ہوئی تو فوراً ہوٹل پہنچے۔ سائیکل پھینک کر اندر آئے اور آتے ہی دستی کی طرح پھٹ پڑے۔

''ڈزن ______ ڈزن ______ لے گیا شیر کا بچہ۔ کیا یاد کرے گی؟''

میں نے پوچھا:۔

''بات کیا ہوئی؟''

''وہی بھئی پرانی بات۔ پہلاں ہس ہس لایاں یاریاں

پچھوں رو کے دیندیاں دس

محبت کسی سے کی اور شادی کسی سے کر لی کھیل ختم پیسہ ہضم۔ وہ بھی میرا بھائی تھا بم لے کر کھڑا ہو گیا جوں ہی ڈولی گذری گرج کر میدان میں کود پڑا۔

''ہا۔۔۔۔بے وفا عورت۔۔۔۔۔۔ ڈزن۔ ہم تو اسی عشق کے قائل ہیں یا شادی اور یا

ڈزن!''

اور جب تھوڑی دیر بعد حادثے کی پوری اور اصلی رپورٹ ملی تو انہیں سب سے زیادہ مایوسی ہوئی۔ آپ ایک حسرت بھری آہ بھر کر بولے:۔

''یہاں ہر بات افواہ اور ہر افواہ جھوٹی نکلتی ہے۔ میں بھی سوچتا تھا شہر لاہور میں ایسا دلیر عاشق جو بدلہ لے سکے یہاں تو عشق کرنے کے بعد لتا کے گانے سنے جاتے ہیں ذرا لگائیں تو وہ ریکارڈ چاچا جی!

''تو نے میرے لخت جگر کو چھو لیا''

گذشتہ سال سردیوں کی ایک خوشگوار رات کو اسی چوک میں ''چوتھی سالانہ کباب کانفرنس'' ہوئی۔ ایک بڑے سے کمرے میں سرخ رنگ کا لمبا چوڑا قالین بچھا دیا گیا جس پر محلے کے بزرگ اور نوجوان بیٹھ گئے۔ وسط کے بوتل کے کارکوں سے بنایا ہوا ایک عظیم الشان کباب طشت میں پڑا ہوا تھا۔ کباب پر پھولوں کے ہار ڈالے گئے تھے اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ ایک پہلوان کو مجلس کا صدر چنا گیا۔ جب آپ نے پہلوانی کا نشان یعنی کیسری پگڑی سر پر رکھ کر خطبہ صدارت شروع کیا تو حاضرین پر اور صدر صاحب پر گلاب دانیوں میں عطر چھڑکا گیا۔ ایک پہلوان ذرا کھنکار کر بولے:۔

''سجنو! سیانے کہہ گئے ہیں کہ جان کے ساتھ جہان ہے اگر بدن میں جان نہیں تو پھر زندگی کا کیا لطف؟ پھر تو کباب بھی مزا دینے سے رہے کیوں جما پہلوان جی۔ جُما پہلوان بولا:۔

''لکھ روپے دی گل اے خلیفہ جی۔''

صاحب صدر گویا ہوئے:۔

''آج کل فیشن کا زمانہ ہے۔ چائے عام ہو گئی ہے۔ اور لسی کباب ڈاؤن ہو رہے ہیں۔ ہمارے بڑے خلیفہ جی کہا کرتے تھے کہ بچہ افیم کھا کر لیٹ جانا لیکن چائے کے پاس نہ جانا۔ سو بابا جی ہم نے تو اس چڑیل کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا کیوں رمزی پہلوان جی؟'' رمزی پہلوان

کدو ایسا سر ہلانے لگے۔

"تو بابا جی میں کہہ رہا تھا کہ کباب اول نمبر خوراک ہے۔ شاید آپ کو کباب کے معنی معلوم نہیں۔ ٹھہریئے میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ بندہ کہتا ہے گوشت کب کھاؤں؟ گوشت کہتا ہے "اب" کھاؤ۔ اس "کب" اور "اب" کو جوڑ دو کباب تیار ہو جائیگا۔

ساری محفل کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

خطبہ صدارت کے بعد سنہری ورق لگے گرم گرم مسالحہ دار لذیذ کبابوں سے بھرے ہوئے کئی طشت آ گئے۔ تھالیوں کے بجائے بڑے بڑے طشتوں میں ہی مہمانوں نے کباب کھانا شروع کر دیئے۔ کھانے کے بعد کبابوں کی تعریف میں پنجابی نظمیں پڑھی گئیں۔ رحیم بابا نے کھڑے پر امیر خسرو کی مشہور غزل سنائی جس کا ایک شعر مجھے آج بھی یاد ہے۔

مرا درویش راکشتی بہ غمزہ
کرم کردی الٰہی زندہ باشی

غزل کے بعد کشمیری اور پشاوری قہوے کا دور شروع ہوا۔ خوش بودار گرم گرم قہوے سے بھرے ہوئے چمکیلے ساوار درمیان میں لا کر رکھ دیئے گئے۔ قہوے میں دار چینی اور بادیاں خطائی کی مہک سب سے الگ تھی۔ مہمان گری سردی میں بے پناہ کباب کھا گئے بلکہ ایمی پہلوان نے مصنوعی بڑے کباب کو حسرت بھری نظر سے تکتے ہوئے گُما پہلوان کے کان میں کہا:۔

"اگلی بار بڑا کباب بھی اصلی ہونا چاہئے۔ کیا ہوگا بڑی حد ایک بکرا لگ جائیگا سب سے آخر میں مسٹر معراج دین اختر نے اپنی پنجابی کی ایک نظم سنائی جو بے حد پسند کی گئی۔ خاص طور پر آخری بند پر لوگ اچھل اچھل پڑے وہ بند یوں تھا:۔

اسی زور لا کے بازی جیتے آں
ممبر کرسی تے بیٹھ کے ہار دیندا اے

اختر لاٹو مجھیا' ایناں لیڈراں نے
جیہڑا اٹھ دا اے جالی مار دیندا اے

ہمارے حاجی صاحب کہنے کو تو حاجی ہیں لیکن اصل میں آپ پنجابی کے شاعر اور حکیم بھی ہیں۔ حال ہی میں اس بات کا انکشاف بھی ہوا کہ آپ کلکتے میں سٹیج پر کام بھی کر چکے ہیں اور پہلے ہی کھیل میں انہیں ہیرو کا کام مل گیا تھا۔ تفصیل ان ہی کی زبانی سنیئے "ٹمپرنس ہال میں پرتھوی راج سنجوگتا" کھیلا جا رہا تھا۔ میں بھی کھیل دیکھنے ادھر آ نکلا۔ بالوں میں تیل ذرا خوشبودار ہی لگا رکھا تھا۔ جب کھیل شروع ہوا۔ تو اچانک ڈائریکٹر کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا۔ فوراً پردہ گرا دیا گیا اور آپ نے سٹیج سے چھلانگ لگائی اور میرے پاؤں پکڑ لئے اور کہا:۔

"حضور نا امید نہ کیجئے گا میں بڑی امید لے کر آیا ہوں۔"

میں نے پوچھا ___ لیکن حضرات جی بات کیا ہے؟"

اس پر بولے ___ میں آپ ایسے نوجوانوں کی تلاش میں تھا۔ میں آپکو ------شہاب الدین غوری کا پارٹ دینا چاہتا ہوں۔ میں بڑا حیران ہوا۔ دل میں خوش بھی ہوا کہ پارٹ مل رہا ہے۔ میں نے فرضی پریشانی سے کہا:۔

لیکن میں غوری کا پارٹ -----"

"ہاں حضور! میں نے یہ پارٹ بڑے غور کے بعد دیا ہے۔"

چنانچہ اس خاکسار نے شہاب الدین غوری کا پارٹ کرنا شروع کر دیا۔ آخر میں جب وہ سکندر والی تقریر آئی تو میں نے ذرا تبدیل کر دی۔ تمہیں سناؤں؟ پہلے میں نے اقبال کا شعر پڑھا:۔

"اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو"

بھائیو! تم نے ایران فتح کیا۔ توران فتح کیا۔ ترکستان فتح کیا۔ تم افریقہ کے جنگلوں میں

لڑتے رہے اور اب جب کہ تم نیپرلس ہال کے باہر پہنچے ہو تو ٹکٹ خریدتے ہوئے ہچکچا رہے ہے۔تمہارے پیسے ختم ہو گئے ہیں۔

اگر آپ حاجی صاحب کی شکل دیکھ لیں تو میرا دعویٰ ہے کہ آپ ایک ہفتہ تک خواب میں ڈرتے رہیں گے۔حاجی صاحب نے حج یوں کیا کہ آپ کھجوروں کا کاروبار کرنے بصرہ تشریف لے گئے۔اور واپسی پر حج بھی کرتے آئے پہلے آپ لامذہب تھے۔قاہرہ میں ایک فلسطینی دہریئے سے فلسفہ ء مذہب پر بحث ہوگئی۔تین گھنٹے کی گرما گرم بحث کے بعد وہ دہریہ پریشان ہوگیا۔اور حاجی جی کا مذہب پر سے اعتقاد اٹھ گیا۔دوستوں نے اس کایا پلٹ کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا:۔

''مجھے اب پتہ چلا کہ ہر دہریہ مسلمان ہوتا ہے''

'''لیکن آپ تو پہلے بھی مسلمان تھے''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن دہریہ نہیں تھا''

بصرہ میں آپ گھر سے گھی خریدنے بازار میں آئے ایک شیخ سے گھی طلب کیا اور ساتھ ہی کہہ دیا اصل گھی چاہیے۔اس شیخ نے جب فقرے میں ایک عربی لفظ سنا تو فوراً عسل یعنی شہد حاضر کر دیا۔حاجی صاحب نے شہد دیکھا تو سوچا تو شاید بصرے میں اصل گھی ایسا ہوتا ہے۔گھر آ کر جب بیوی کو دکھایا تو حقیقت آشکار ہوئی۔فوراً واپس ہوئے۔شہد واپس کر دیا۔دوسری دوکان پر گئے تو وہی حادثہ پیش آیا۔تیسری دوکان پر بھی وہی کچھ ہوا لاچار ہو کر گھر پلٹ آئے اور بیوی سے کہنے لگے:۔

''نیک بخت یہاں کوئی شئے اصل کہہ کر مت مانگنا۔''

ایک بار آپ کا چالان ہوگیا۔آپ سائیکل پر سوار تھے اور تیزی میں سپاہی کے ہاتھ کاٹ کر چوراہا عبور کر گئے۔سپاہی نے سیٹی بجائی لیکن آپ نے رکنے کی بجائے سائیکل اور تیز کر دی۔سپاہی نے جلدی سے اپنی سائیکل پکڑی اور اگلے چوک میں حاجی صاحب دھر لئے

گئے۔سپاہی نے پوچھا:۔

''آپ نے سیٹی کی آواز پر سائیکل کیوں نہیں روکا تھا؟''

حاجی صاحب نے جھٹ جواب دیا:۔

''آپ نے میرا نام لے کر سیٹی تھوڑی بجائی تھی؟''

اگر آپ موچی دروازے سے شاہ عالمی کی طرف جائیں اور سڑک کی بجائے باغ کے درمیان سے ہو کر گذریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ دنیا واقعی ایک مسافر خانہ ہے۔اور یہاں ہر آدمی مسافر کی طرح پڑا ہے۔کہیں یوسف زلیخا پڑھی جا رہی ہے کہیں چوسر کھیلی جا رہی ہے۔کہیں مجمع لگا ہے۔کہیں سکول کے بچے کھیل رہے ہیں اور کہیں پتنگ باز ڈوری فروخت کرنے والوں کے گرد جمع ہیں۔میں عموماً اس باغ میں سے گزرا کرتا ہوں۔کل یہاں سے گزرتے ہوئے میں نے ایک پٹھان کو جڑی بوٹیاں بیچتے دیکھا۔وہ تقریر بھی کر رہا تھا۔ایک بدشکل سیاہ بوٹی کی خشک جڑ اس کے ہاتھ میں تھی اور کہہ رہا تھا:۔

''بھائی صیب! بتاؤ یہ بوٹی کس نے بنایا؟ تم کہو گے کہ اسے میں نے بنایا۔نہیں تم کہو گے اسے خان صاحب نے بنایا! نہیں! تم کہو گے اسے خدا نے بنایا! نہیں! تو پھر کس نے بنایا؟ بتاتا ہوں۔میرے بھائی اسے زمین نے بنایا اور نہ خدا نے بنایا اسے بنایا ہے خدا کی قدرت نے۔میرے اللہ کی قدرت نے۔۔۔۔''

اس بوٹی کو اللہ کی قدرت نے ہی بنایا تھا لیکن خاں صاحب کی تخلیق میں ضرور کسی بدشکل بوٹی کا ہاتھ۔

انہی دروازوں کے اندر پراسرار گلیوں کے ایک دو منزلہ تنگ و تاریک مکان میں ایک شخص نے اپنی سترہ سالہ جوان بیوی کی ناک کاٹ دی۔اس لیے کہ وہ فلمی گانے گایا کرتی تھی۔اور اسے فلمی گیتوں سے عشق تھا۔شادی کے بعد اس نے پہلی مرتبہ سینما دیکھا اور گھر آ کر خاوند سے فرمائش کی کہ وہ اسے دو تین فلمی ریکارڈ خرید کر لا دے خاوند نے سختی سے انکار

کر دیا۔ اسی شام جب گھر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی چہیتی نوجوان بیوی گا رہی تھی۔ اور ناچ رہی تھی۔

روروکاٹی رین بے دردی آجائے

چنانچہ بے دردی نے اندر آکر بڑے آرام سے رورو کر رین کاٹنے والی کی ناک کاٹ دی۔
اسی محلے میں ایک قصاب نے ایک طوطا خریدا اور اسے اپنے گھر لے آیا۔ طوطا پہلے ہی سے باتیں کرنا سیکھ چکا تھا۔ چنانچہ وہ بہت جلد گھر میں بچوں کی نقلیں اتارنے لگا ایک دن کرنا خدا کا کیا ہوا کہ قصاب نے گھر پر ایک بکرا ذبح کر ڈالا۔ طوطا بھونچکا سا رہ گیا۔ اس نے فوراً اپنی آنکھیں پھیریں۔ اچک کر منڈیر پر بیٹھا اور بولا:۔

''اماں جی! مجھے معلوم نہیں تھا یہ قصائیوں کا گھر ہے۔''

اتنا کہا اور پھر سے اڑ گیا۔ کس قدر امن پسند تھا یہ طوطا! خدا جانے آج کہاں گیا ہوگا؟ کہیں باغ میں پھل کتر کتر کر کھا رہا ہوگا۔ اسے کسی بین الاقوامی امن کانفرنس کی صدارت ملنی چاہیے۔

میں پرانے لاہور کی بات کر رہا ہوں۔ انارکلی اور شالیمار کے لاہور کی بات کر رہا ہوں۔ اس لاہور کے ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں آپ کو چکن سینڈوچ نہیں ملیں گی۔ لیکن میزوں کے آس پاس مرغیاں دانہ دنکا چگتی ضرور ملیں گی۔ آپ کسی قہوہ خانے میں جا کر بیٹھ جائیں۔ چائے پئیں یا نہ پئیں۔ آپ کی تنہائیوں میں کوئی خلل نہ ہوگا۔ ویسے بھی یہاں چائے کم اور لسی زیادہ استعمال ہوتی ہے۔ ان گلی کوچوں میں نہار منہ چائے پینا اپنے پاؤں پر کلہاڑہ مارنے کے مترادف ہے۔ صبح صبح لوگ جا بجا لسی پیتے دکھائی دیں گے۔ لسی گرمیوں میں ہی نہیں سردیوں میں بھی چلتی ہے۔ انہی لسی پینے والے محلوں میں سے گذرتے ہوئے آپ کو جھکے جھکے چھجے اور ٹھنڈی ٹھنڈی نیم روشن ڈیوڑھی والا ایک مکان نظر آئے گا اور آپ کا دوست آپ کو بتائے گا کہ اس مکان میں مولانا حالی یا مولانا محمد حسین آزاد رہا کرتے تھے۔

مستی گیٹ سے ٹکسالی کی طرف جاتے ہوئے آپ منٹو پارک کے پہلو سے گذرتے ہیں تو قلعے کے اوپر سے موتی محل کے زنگ آلود جھروکے آپ ویران آنکھوں سے دیکھتے چلے جائیں گے۔ کہاں گئے وہ دن؟ وہ کنیزوں کے جگمگٹے وہ شوخ چشم باندیوں کے قہقہے شاہی محلات کی روشنیاں' جالی دار جھروکوں میں سے دریائے راوی کی سست رفتار لہروں کا نظارہ کرتی ہوئی شہزادیوں کے اداس چہرے اور دیوان عام کی غلام گردشوں میں چوب داروں کی رہ رہ کر گونجنے والی آوازیں ______ پرانا لاہور اپنے سینے میں صدیوں کے رومان چھپائے خاموش ہے چھوٹا سا میدان پھیلا ہوا ہے۔ کہتے ہیں کہ انارکلی کو اس جگہ دیوار میں چنا گیا تھا۔ لیکن آج اس میدان میں آم اور شیشم کے درخت چپ چاپ کھڑے ہیں۔ سر شام دریا کی جانب سے بھیگی ہوئی ہوا چلتی ہے تو ان درختوں کی ٹہنیوں میں سرگوشیاں سی ہونے لگتی ہیں جیسے یہ ٹہنیاں کہہ رہی ہوں:۔

''انارکلی! ہم تجھے ہمیشہ یاد رکھیں گی۔ ہماری سرگوشیاں میری آخری فریادوں کی صدائے بازگشت ہیں۔ تیرا لاہور تجھے کبھی نہیں بھولے گا اور ان سرگوشیوں کے ساتھ سنسان رات کی تنہائیوں میں چمکیلے ستاروں کی سہمی سہمی چھاؤں تلے کوئی راہ گم کردہ بلبل کسی کو پکارتی ہوئی مقبرہ نور جہاں کے گنبد کے اوپر سے گذر جاتی ہے۔

ڈرامہ لیلیٰ مجنوں اصلی

کرداران

لیلیٰ

مجنوں

مولوی

باپ اور کئی گدھے

پہلا سین

(پردہ اٹھتا ہے۔ مکتب میں مولوی صاحب بچوں کو سبق پڑھا رہے ہیں۔ لیلیٰ اور مجنوں دونوں بوریے پر بیٹھے سبق یاد کر رہے ہیں۔ اور اصل میں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر عشق کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش ناکام کر رہے ہیں)

ایک لڑکا۔ اب جا۔ کل آ۔ پرسوں جا۔ اور کبھی نہ آ

دوسرا لڑکا۔ گنا چھیلو' مرغی چھیلو' آج منگل وار ہے کل جمعرات ہوگی۔ اور پرسوں اتوار کو چھٹی ہوگی۔

تیسرا لڑکا۔ دو آدمی کہیں کام کو جا رہے تھے۔ دو عورتیں گھر کو آ رہی ہیں ان کے سروں پر گھڑے ہیں۔ آؤ گھڑے توڑیں۔

پہلا لڑکا۔ نہیں بھائی گھڑے نہیں بلکہ سر توڑیں۔

مولوی (چیخ مار کر) چپ رہو کم بخت کے بچو؟ میرا سر کیوں کھا رہے ہو۔
اری لیلیٰ

لیلیٰ۔ جی مولوی جی!

مولوی۔ بیٹی ادھر کیوں دیکھ رہی ہے؟

لیلیٰ۔ (مجنوں کو دیکھ کر) مولوی جی !
درمیان میں رکھ کر وہ شمع کو کہتے ہیں ظالم!
کہ دیکھیں اس طرف پروانہ جاتا ہے یا اس طرف آتا ہے

مولوی۔ (منہ بنا کر) اری ظالم شعر کا کیوں حلیہ بگاڑ دیا۔

مجنوں۔ حضور انور! شعر کہنا خالہ جی کا گھر نہیں۔ شعر آسان نہیں۔

شعر کہنا پیشہ ہے جواں مردوں کا
پیر گردوں بھلا کیا شعر کو جانہیں پائے

دوسرا لڑکا۔ (ہاہا!) مکرر ارشاد ہو مسٹر مجنوں!

مولوی۔ (چیخ کر) خاموش! اچھا اب پتہ چلا کہ تم دونوں شعر کیوں پڑھتے رہتے ہو۔ کیا تمہیں عشق تو نہیں ہو گیا؟

مجنوں (سینے پر ہاتھ مار کر) آہ عشق کہتے ہیں کسے؟ حسن کسے کہتے ہیں لوگ تو بات کا جھگڑ بنا دیتے ہیں۔

مولوی۔ ارے مجنوں! یہ جھگڑ کیا ہوا؟

مجنوں۔ میرے والد صاحب کا نام تھا۔

مولوی۔ تمہارے والد کا؟

لیلیٰ۔ جی ہاں میرے چچا جان کا

مولوی۔ (چیخ کر) خاموش! حرامزادو! نکل جاؤ چلو چھٹی!

دوسرا سین

پردہ گرتا ہے اور بہت زیادہ گر پڑتا ہے۔ پھر اوپر کو اٹھتا ہے۔ پھر گرتا ہے اور پیچھے سے آواز آتی ہے۔ اے کیوں گرتا ہے نادان؟ لیلیٰ کے باپ کا گھر پس منظر میں صرف دو گدھے بول رہے ہیں)

باپ۔ کیوں ابن عامر! کیا قصہ ہے؟

مجنوں۔ (منہ میں) حضور کھلوائی آپ کی قصد ہے (اور نیچی آوازیں) بس حاضری بھرنے حاضر ہوا تھا۔

باپ۔ مگر تیری آواز کیوں پست ہے۔

مجنوں۔ حضور شادی کا بندوبست ہے۔

باپ۔ کس سے شادی؟

مجنوں۔ حضور! آپ کی بیٹی سیاہ فام لیلیٰ سے۔

باپ۔ بس بس ناہنجار! خاموش او عرب کی کھجوروں پر پلے ہوئے آوارہ بدو! تیری یہ ہمت کہ قبیلے کے سردار کی بیٹی کا رشتہ مانگتا ہے۔

مجنوں۔ حضور! میں رشتہ نہیں مانگتا۔ میں تو صرف شادی کرنا چاہتا ہوں۔

باپ۔ یہ شادی ہرگز نہیں ہو سکتی۔

مجنوں۔ کیوں؟

باپ۔ اس لئے کہ تو میٹرک فیل ہے اور لیلیٰ نے منشی عالم پاس کیا ہے۔

مجنوں۔ حضور! میں بھی منشی فاضل کا امتحان دے رہا ہوں۔

باپ۔ پھر بھی یہ رشتہ نامنظور ہے۔

مجنوں۔ حضور میں ٹائپ بھی جانتا ہوں۔

باپ بس بس! دور ہو جاؤ میری آنکھوں سے

مجنوں۔ حضور! کتنی دور۔

باپ۔ دور ______ بہت دور ______

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا سین

(لیلیٰ کی شادی ہو رہی تھی کہ اس نے مجنوں کی جدائی میں زہر پی لیا۔ مجنوں امریکی بش شرٹ پہنے۔ جنگلوں‘ صحراؤں کی خاک چھان رہا ہے)

مجنوں!۔ او خدایا! میری لیلیٰ کدھر گئی۔ لیلیٰ لیلیٰ!! تو کدھر چلی گئی؟

ایک آواز۔ سن او عاشق‘ نامراد! لیلیٰ اپنی صحراؤں کی خاک چھانتی چھانتی مر گئی ہے۔

مجنوں۔ او مسٹر! تو مجھے ایکسپلائیٹ کرنے والا کون ہے؟

آواز۔ میں؟ ارے مجنوں تو مجھے نہیں پہچانتا۔ میں تو ہر ڈرامے میں غیبی آواز کا پارٹ کرتا ہوں۔

مجنوں۔ اہا! تو تم ہو ماسٹر کالے خاں مجھو!

آواز۔ ہاں۔

مجنوں۔ تو سناؤ بھائی! بھائی کا کیا حال ہے؟ اب کے تنخواہ ملی یا نہیں۔

سناؤ ویسے خیریت ہے نا! یار آج تو پارٹ کرتے کرتے پاؤں شل ہو گئے ہیں اور منہ میں

ریت گھس گئی ہے۔ آج تو کچھ اڈوانس ملنا چاہیے۔ یار اس سالے بجلی والوں کو کہہ کر جب آندھی کا سین آئے تو پنکھے اتنی تیز نہ چھوڑا کریں۔

آواز۔ استاد رحمت علی! وہ بجلی والے جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں۔ اچھا بھئی اب یہ باتیں چھوڑو اور ذرا اپنے پارٹ کی طرف دھیان کرو۔ کم بخت ہر آدمی ہمیں باتیں کرتا دیکھ کر گھور رہا ہے۔

مجنوں۔ (ایک دم کھڑے ہوکر) ہائے لیلیٰ مرگئی! مجھے بیوہ ______ میرا مطلب ہے۔ مجھے یتیم کرگئی! نہیں نہیں تو ابھی نہیں مر سکتی۔ تو ابھی کیسے مر سکتی ہے ہم نے تو کنوئیں میں ڈوب کر مرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ اری ظالم عورت اگر مرنا ہی تھا تو کم از کم اپنا راشن کارڈ تو مجھے دے جائیں۔ اور نہیں تو اپنے مکان کی الاٹمنٹ ہی میرے نام تبدیل کرا جاتیں۔ اب بتا کہ تیرا عاشق ناشاد کہاں رہے؟ کہاں سے کھائے؟ تیری بکریوں کا دودھ پی پی کر کب تک زندہ رہوں گا۔

آواز۔ پیارے مجنوں!

مجنوں۔ (چونک کر) ہیں! یہ تو میری لیلیٰ کی آواز ہے۔ لیلیٰ! (کسی شے سے ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے) ہیں! یہ کیا۔

آواز۔ الو کے پٹھے دیکھ کر نہیں چلتے۔

مجنوں۔ معاف کرنا بابا میں عشق کا اندھا ہوں۔ مجھے صبح کو بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

پہلی آواز۔ پیارے مجنوں!

مجنوں۔ تنگ آکر اُلو کی پٹھی کہاں سے بول رہی ہے تو؟

آواز۔ پیارے نہیں! میں قبر 555 سے بول رہی ہوں۔ آجاؤ پیارے! تیرے بغیر یہ قبر تو مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہی ہے اور میں اس سے دوڑ رہی ہوں۔ مجنوں۔ کیا کہا! تو قبر میں ہے۔ اور مجھے بھی بلا رہی ہے؟

لیلیٰ۔ ہاں پیارے! کیا تم پرانے عاشقوں کی طرح میری قبر پر گر کر اپنی جان نہیں دو گے؟

مجنوں۔ مجھے معاف کرنا میری پیاری لیلیٰ میں ضرور مرجاتا اگر آج شام مجھے ایک ضروری کام نہ ہوتا۔ خدا کی قسم یقین کرنا بڑا ضروری کام ہے۔ اچھا خدا حافظ ٹاٹا------!

مجنوں بھاگ جاتا ہے۔ اور لیلیٰ پکارتی رہ جاتی ہے۔ پردہ گرتا ہے۔ اور ایک آدمی اونچی آواز سے یہ شعر پڑھتا ہے۔

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے

لاہور ــــــ چہار دَرویش

پہلے درویش نے چاء کی تیسری پیالی ختم کرتے ہوئے کہا۔

صاحبو! ہم چاروں درویش صبح سے اس ہوٹل میں بیٹھے ہیں۔اور کئی سیٹ چاء منگوا کر پی چکے ہیں۔ہم نے ملک ملک کے حال سنائے ہیں۔اور دیس دیس کی باتیں کی ہیں۔لیکن جس شہر میں ہم ایک ماہ سے مقیم ہیں اس کی بابت ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔کیا عجب کہ طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے اور شہر لاہور کی داستان بیان کرنے کی آرزو دل ہی دل میں رہ جائے۔تو قبول فرمایئے کہ یہ خاکسار لاہور میں گذارے ہوئے کچھ دنوں کے احوال بیان کرتا ہے۔

میرے درویش بھائیو! لاہور بڑا پرانا شہر ہے۔لیکن جدید تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ ان کی سڑکیں لاہور سے پرانی ہیں ا۔دراصل پہلے سڑکیں دریافت ہوئی تھیں۔اور لاہور بعد میں آباد ہوا تھا۔یہ لاہور سے پہلے بھی تھیں اور لاہور کے بعد بھی رہیں گی۔یہ بڑی رومانوی سڑکیں ہیں۔آپ کو ان پر سے گذرتے ہوئے محسوس ہوگا۔کہ آپ خوبصورت یونان کی پہاڑیوں میں گھوم رہے ہیں۔ان سڑکوں کی دونوں جانب سایہ دار درخت ہیں۔ان

درختوں کی شاخوں پر پھلوں کی بجائے سینما کے بورڈ لٹکتے ہیں۔گرمیوں میں ان کی چھاؤں گرم ہوتی ہے اور سردیوں میں ٹھنڈی یہ بڑے پراسرار درخت ہیں۔لاہور کا موسم سردیوں میں سخت سرد اور گرمیوں میں سخت گرم ہوتا ہے سردیوں کا موسم عام طور پر دسمبر سے شروع ہو کر فروری میں ختم ہو جاتا ہے لیکن موسم گرما مارچ سے شروع ہوتا ہے اور نومبر تک شروع رہتا ہے اور ختم نہیں ہوتا۔صرف تین ماہ کے لئے ذرا آرام کرتا ہے۔اس اعتبار سے لاہور کا موسم گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں سخت سرد ہوتا ہے۔

برسات کا موسم لاہور میں زبردستی لایا جاتا ہے چنانچہ یہ ایک ماہ کے لئے آتا ہے اور ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ ٹھہر کر واپس چلا جاتا ہے۔چنانچہ اس خاکسار نے لاہور میں ایک عجیب شے کا مشاہدہ کیا ہے۔وہ یہ کہ اس شہر میں بارش کم ہوتی ہے۔لیکن کیچڑ زیادہ پیدا ہوتا ہے۔پہلی بارش میں نہانے کے بعد سارا شہر تالاب بن جاتا پھر ہر شخص پھل پھل کر چلتا ہے۔اور تھوڑی دور چلنے کے بعد پھول جاتا ہے۔

لارنس باغ لاہور کا سب سے خوبصورت باغ ہے۔اور صاحبو! میں نے ایسا خوبصورت باغ کہیں نہیں دیکھا۔یہاں بے شمار درخت اور بے شمار مالی ہیں ان گنت پھول اور ان گنت پہریدار ہیں۔اسی باغ کے پہلو میں ایک لمبا چوڑا چڑیا گھر ہے۔اس چڑیا گھر میں چڑیاں بہت کم اور دلہنیں بہت زیادہ ہیں۔اس چڑیا گھر میں میں نے تاتار کی ایک ہرنی دیکھی جو سلاخوں کے عقب میں بیٹھی اداس نگاہوں سے ایک منزلہ بس کے حال پر سے گذرتے دیکھ رہی تھی۔

بھائیو! میں ابھی تک اس راز کو حل نہیں کر سکا کہ تاتار سے باہر نکل کر جانور اداس کیوں ہو جاتے ہیں؟

''دو منزلہ بس لاہور کی خاص چیز ہے۔اس دوسری منزل میں بیٹھ کر آپ لاہور کو سر سے

پاؤں تک دیکھ سکتے ہیں۔ دوسری منزل میں سے باہر جھانکتے ہوئے آپ کو معلوم ہوگا کہ لاہور بڑے چھوٹے قد کا شہر ہے۔ لارنس باغ کے عقب میں ایک بہت بڑا میدان ہے۔ جہاں بہار کے دنوں میں گھوڑے دوڑتے ہیں۔ اور آدمی شور مچاتے ہیں۔ صاحبو! مجھ پر یہ بھید آج تک نہیں کھل سکا کہ وہاں آدمی گھوڑوں کے دوڑنے کی وجہ سے شور مچاتے ہیں یا ان کے شور مچانے سے گھوڑے دوڑتے ہیں۔ لاہور کے قہوہ خانے مصر و بغداد کے قہوہ خانوں کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اگر ان قہوہ خانوں میں کھجوریں اور شہد مل سکتا ہے تو ان میں اور بغداد کے قہوہ خانوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ ان قہوہ خانوں میں آپ خیالے بدخشانی قالینوں پر بیٹھ کر قہوہ پی سکتے ہیں۔ قہوہ پی کر لیٹ سکتے ہیں۔ اور لیٹنے کے بعد سو بھی سکتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ یہاں بغداد کا اصل شہد نہیں ملتا۔ ایک بار میں نے اس شہر میں ایک پرانے قہوہ خانے میں قہوہ پیتے ہوئے شہد کی خواہش ظاہر کی۔ قہوہ خانے کے مالک نے کہا کہ وہ ابھی منگوا دیتا ہے۔ میں اس جواب پر بہت خوش ہوا۔ مگر جب شہد آیا تو میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ میں آج بھی اس شش و پنج میں ہوں۔ اور یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ مکھیوں کا شہد تھا یا شہد کی مکھیاں مجھے شہر کے صرف ایک ہی ہوٹل میں جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ جہاں سے میں گھبرا کر باہر نکل آیا تھا۔ اس ہوٹل میں بڑے دروازے پر لکھا تھا۔

''گرمی کی وجہ سے دروازہ بند ہے۔ پچھلے دروازے سے تشریف لائیں''

جب میں پچھلے دروازے پر پہنچا تو وہاں لکھا تھا۔

''اچھا اسی دروازے سے تشریف لے آئیں۔''

جب میں اسی دروازے کے باہر پہنچا تو وہاں لکھا تھا۔

''کرایہ کے لئے خالی ہے''

مجھے چکر آ گیا اور میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

اس پر دوسرے درویش نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

سائیاں! چکر تو مجھے بھی آ رہے ہیں۔ لیکن میں آپ کو اس شہر کے ایک میلے کا حال ضرور سناؤں گا۔

اس میلے کو پارکا کہتے ہیں۔ اس کا یہ نام اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ دریائے راوی کے پار لگتا ہے۔ اگر یہ میلہ دریا کے اس کنارے پر لگتا تو بھی یہ اتنا ہی بارونق ہوتا۔ لیکن دریا کا دوسرا کنارہ عام طور پر لگتا تو بھی یہ اتنا ہی بارونق ہوتا لیکن دریا کا دوسرا کنارہ عام طور پر خوبصورت ہوتا ہے۔ یہ میلہ مقبرہ جہانگیر میں دو روز تک جاری رہتا ہے۔ میلے کے روز شام کو ایکا ایکی بارش آ گئی۔ سنری تھیٹریکل کمپنی کے تمام ایکٹر سٹیج پر سے بھاگ کر خیموں میں گھس گئے۔ اور دکاندار مٹھائیوں کے تھال لے کر ان تختوں کے نیچے چھپ گئے جن پر وہ خود بیٹھے ہوئے تھے۔ بارش رکی تو میلہ پھر اپنے جوبن پر آ گیا۔ دیہاتی کسانوں کی ٹولیاں گاتی بجاتی گذر رہی تھیں۔ زندہ دل لوگ چاء کا سامان لے کر کشتیوں میں بیٹھے دریا کی سیر کر رہے تھے۔ باغ میں دو طرفہ بجی ہوئی دوکانوں اور ہوٹلوں کے باہر فلمی گیتوں نے شور مچا رکھا تھا۔ ایک جانب کوئی صاحب دوائیاں بیچ رہے تھے۔ اور چیخ چیخ کر لوگوں کو متوجہ کر رہے تھے۔

''دھند ہو۔ جالا ہو گکرے ہوں۔ آنکھیں خراب ہوں۔ ایک سلائی لگائیں اور شفا پائیں۔ اس کے علاوہ کتے نے کاٹا ہو۔ سر میں درد ہو۔ پیٹ میں چوہے دوڑتے ہوں ایک سلائی لگائیں اور شفا پائیں۔''

دوسری جانب یتیم خانے کا آدمی ہارن میں آگے رکھے زور زور سے چلا رہا تھا۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی سے غالباً ان کی مراد آواز تھی۔ میں نہیں جانتا اس آدمی کی خودی کتنی بلند تھی۔ مگر ہاں اس کی آواز کافی بلند تھی۔ بلکہ خودی سے بھی زیادہ بلند تھی۔

صاحبو! اس آدمی کے پاس ہی ایک اندھا فقیر اپنی ٹوپی میں طوطے کے پر لگائے گردن ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا۔

''پیارے مسلمانو! آنکھیں بڑی نیامت ہیں''

میرا خیال تھا کہ آنکھیں صرف اندھوں کے لئے ہی ایک نعمت ہوتی ہیں۔ لیکن جب میں نے آم کے پیڑوں تلے رنگ برنگ کپڑوں والی لڑکیوں کو پتنگیں بڑھاتے دیکھا تو مجھے اس اندھے کی بات یاد آ گئی۔

واقعی آنکھیں بڑی نیامت ہیں۔

جامن کے درخت تلے گول گول پٹڑی پر ریل گاڑی چل رہی تھی۔ صندوق نما ڈبے ایک دوسرے کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ بچے دو دو پیسے کا ٹکٹ خرید کر ان میں سوار ہو جاتے۔ اور ریل چل پڑتی۔ اس سفر میں کوئی سٹیشن۔ کوئی پڑاؤ نہ تھا۔ بس سفر تھا۔ اور گاڑی جہاں سے چلتی پھر وہیں آن ٹھہرتی تھی لوہے کے بڑے سے کھمبے کے ساتھ ہلکے پھلکے ہوائی جہاز گول دائرے میں چکر لگا رہے تھے۔ بچے' عورتیں اور مرد ان میں بیٹھ کر بیس بیس چکر لگاتے اور جب زمین پر اترتے تو چکرائے ہوئے ہوتے۔

کچھ بچے دوربین کی مدد سے تصویریں دکھانے والے کے گرد جمع تھے۔

تصویریں دکھانے والا ایک آنہ جیب میں ڈال کر دوربین کسی بچے کی آنکھوں سے لگا دیتا ہے۔

''لنکا شہر دیکھو

''ساون کا اندھا دیکھو

''الو کا پٹھا دیکھو

''اور کلکتہ شہر دیکھو

لنکا سے لے کر کلکتہ تک

اس کے پاس بچوں کا دل لبھانے کے لئے کئی تصویریں تھیں

ایک بوڑھا مٹھائی کی بنی ہوئی

ہر مال دو پیسے میں

کمپنی کا تازہ مال

آ گیا تھا۔

ہاتھی اور آدمی ------------------------

ایک بچہ دو پیسے کا آدمی کھا رہا تھا۔

اور ایک آدمی مٹھائی کا گھوڑا کھا رہا تھا۔

ایک دیہاتی کسان نے اپنا بچہ کندھے پر بٹھا رکھا تھا۔

بچہ اونگھ رہا تھا۔

باپ بار بار پوچھ لیتا

''سو گئے ہے بیٹا؟''

اور یہ بیٹا چونک کر کہتا

''نہیں ابا۔ گنڈیریاں لے دو

ایک بچی کشکول ہاتھ میں لئے اس بھرے میلے میں بھیک مانگ رہی تھی''

ہر آدمی اسے کچھ نہ کچھ دے رہا تھا۔ اس بچی کے پاس ہی ایک نجومی کسی بچے کا ہاتھ دیکھ کر

اس کی ماں سے کہہ رہا تھا۔

اماں!

تیرے بیٹے کا بیاہ۔۔۔۔۔۔

شہزادی سے ہوگا۔۔

لیکن اس کشکول والی شہزادی کا بیاہ۔۔۔۔

کس سے ہوگا؟

میرے درویش بھائیو!

یہ سوال ہاتھ میں کشکول لئے اپنے جواب کا انتظار کر رہا ہے۔"

اور میلے کی رونق بڑھتی جا رہی تھی۔

ناٹک کمپنی والے چیخ چیخ کر لوگوں کو بلا رہے تھے۔

مس!

مشین آرا کا زندہ ناچ گانا۔

ایک ٹکٹ میں دو مزے"

اندر سٹیج پر لیلیٰ مجنوں کا کھیل ہو رہا تھا۔

مجنوں باٹا کے سفید جوتے پہنے صحراؤں کی

خاک چھان رہا تھا۔

اور لیلیٰ کو پکار رہا تھا۔

"آہ لیلیٰ!

مرگئی؟

واہ مرگئی؟

نہیں وہ کبھی نہیں

مرسکتی۔

ہم نے اکٹھے مرنے کا پروگرام بنایا تھا۔

پھر

اس کے پاس میرے سائیکل کا لیمپ اور میرا راشن کارڈ تھا۔

وہ:

یہ چیزیں میرے حوالے کئے بغیر۔۔۔۔۔۔۔

نہیں مرسکتی۔

ہائے اب صبح صبح مجھے چارپائی سے گھسیٹ کر کون اٹھائے گا؟

اور

اب مرے ہوٹل کے بل کون ادا کرے گا؟

اس کے بعد مجنوں صاحب نے ایک ہاتھ کان پر رکھ کر بڑی گرفت اور تیز آواز

میں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

گانا شروع کر دیا۔

دنیا میں غریبوں کو آرام نہیں ملتا۔

تیسرے۔۔۔۔

اور

چوتھے۔۔۔۔

درویش نے چاء کی ساتویں۔۔۔ پیالی ختم کرتے ہوئے کہا۔

''ساجیو! آرام ہمہ گنبد افلاک کہیں نہیں نہ کنج قفس میں اور نہ آرام باغ میں۔

چوتھے درویش نے جلدی سے پوچھا۔

''لیکن آپ کے سر کے درد کا کیا حال ہے؟''

تیسرے درویش نے آہستہ سے کہا۔

اب تو کچھ آرام ہے۔

دیکھو شہر لاہور

پیارے ناظرین! شہر لاہور کی سڑکوں کی سیر آپ کر چکے ہیں۔ آیئے اب آپ کو یہاں کے سینماؤں کی سیر کرائیں۔ چلیے اس سامنے والے سینما میں چلیں یہاں اس وقت سوہنی مہینوال کا ڈرامہ دکھایا جا رہا ہے۔ سوہنی اور مہینوال چناب کے پل پر کھڑے آئندہ ملاقات کا ٹائم فکس کر رہے ہیں۔

سوہنی: ۔ پیارے مہینوال! اب ملاقات کہاں ہوگی؟

مہینوال: ۔ آہ! پیاری اب تو روزانہ پل پر ہی ملا کریں گے۔

سوہنی: ۔ نہیں نہیں مہینوال! ایسا نہ کہو۔ میرا لنگڑا چچا مجھے اب اس جگہ نہ ملنے دے گا۔

مہینوال: ۔ تو پھر کہاں ملا کریں؟ عرب ہوٹل کیسا رہے گا؟

سوہنی: ۔ میرا خیال ہے عرب ہوٹل میں کوئی بدو ہماری شکایت کر دیگا۔

مہینوال: ۔ تو پھر

سوہنی: ۔ کیا خیال ہے اگر تم روزانہ دریا پار کر کے مجھے ملنے آیا کرو۔

مہینوال: ۔ آہ! پیاری سوہنی کاش مجھے تیرنا آتا

سوہنی: ۔ کیا تمہیں تیرنا نہیں آتا؟

مہینوال:۔ بالکل نہیں۔

سوہنی:۔تو پھر مجھ سے عشق کیوں کیا تھا؟

مہینوال:۔تم نے ہی تو کہا تھا۔ کہ تم سے عشق کروں۔

سوہنی:۔ میں نے کب کہا تھا؟

مہینوال:۔تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر مجھے تیرنا نہیں آتا تو پھر تم سے عشق نہیں ہو سکتا۔

سوہنی:۔ بالکل نہیں۔

مہینوال:۔تم کیا پانی کا جانور ہو۔ جو تمہیں تیر کر ہی مل سکتا ہوں۔

سوہنی:۔خاموش بدزبان عاشق!

مہینوال:۔ چپ بدلگام معشوقہ! ہوش کی دوا کرو۔ اگر عشق کے دربار میں گستاخی کی تو زندہ جلا دی جاؤ گی۔

سوہنی:۔تم مجھے زندہ جلانے والے کون ہو۔

مہینوال:۔ میں مہینوال ہوں اور میرے باپ کا نام بھی مہینوال تھا اور ساہیوال کا رہنے والا ہوں۔

سوہنی:۔ لوگو! ڈرو! ماری گئی۔ ہائے ماری گئی۔ میں زندہ ماردی گئی۔

مہینوال:۔(قہقہہ لگاتا ہے) آہاہاہا---------

پیارے ناظرین! چلئے اب دوسرے سینما ہال میں چلیں۔ یہاں شیریں فرہاد کا کھیل دکھایا جارہا ہے۔ وہ دیکھئے فرہاد شیریں کے عاشق شہنشاہ خسرو کے دربار میں کھڑا اپنی درخواست پیش کررہا ہے۔ ذرا غور سے سنئے۔

خسرو:۔کہو میاں فرہاد! کیا چاہتے ہو۔

فرہاد:۔حضور! کچھ نہیں صرف خاک پا کا ایک ذرہ چاہتا ہوں۔

خسرو:۔طبیعت کا کیا حال ہے۔

فرہاد:۔ بخار کا تو آرام ہے ذرا نزلہ باقی ہے۔

خسرو:۔تو پھر یہ نزلہ کس پر گرے گا۔

فرہاد:۔زمین پر سرکار

خسرو:۔ ہیں یہ تمہارے سر پر کانٹے کیوں۔

فرہاد:۔سرکار! یہ جوش جنوں میرے سر پر ہے۔

خسرو:۔ سنا ہے تم شیریں سے عشق کرتے ہو۔

فرہاد:۔جی حضور! آپ کا خادم عشق کے ہاتھوں مجبور ہے۔

خسرو:۔ میرا خیال ہے عشق بھی تمہارے ہاتھوں مجبور ہے۔

فرہاد:۔لیکن جناب میں شیریں سے پاکیزہ عشق کرتا ہوں۔

خسرو:۔ چپ بدزبان! عشق! اور مشک چھپائے نہیں چھپے۔

فرہاد:۔ کہ یہ دونوں میرے آزمائے ہوئے ہیں۔

خسرو:۔اچھا اگر تمہیں شیریں سے پاکیزہ عشق ہے۔ تو پھر ایک کام کرو

فرہاد:۔ارشاد ہو۔

خسرو:۔ وہ سامنے والے پہاڑ میں سے نہر کاٹ کر لاؤ۔ اگر تم نہر کھود کر نکال لائے تو شیریں تمہاری ہے۔

فرہاد:۔وہ نہر کون سی ہوگی۔

خسرو:۔دودھ کی

فرہاد:۔اگر میں حضور تو نہر کے بغیر ہی تین چار من دودھ لا دوں تو کیا خیال ہے؟

خسرو:۔نہیں نہیں۔ مجھے دودھ نہیں نہر چاہیئے۔

فرہاد:۔(سینے پر ہاتھ مار کر) تو پھر یہ عاشق صادق نہر کھود کر ہی لائے گا۔ اور اگر میں نے

پہاڑ کو کھود لیا۔ اور یہاں سے مردہ چوہیا نکلی تو اس کو کہاں لے جاؤں؟

خسرو:۔ اسے خزانہ میں جمع کر دینا۔

فرہاد:۔ جو حکم سرکار۔

(دوسرا منظر)

پیارے ناظرین! اب اس کھیل کا آخری منظر دیکھئے۔ فرہاد نہر کھود رہا ہے اور گا رہا ہے

گانا۔

اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے
کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا
یاد نہ کر دل حزیں بھول ہوئی کہانیاں
حویلے میں وہ گھبراتے تو ہوں گے

کھودے جا، کھودے جا بے قرار دل کھودے جا۔

فرہاد۔ لو اب آدھی نہر تو کھودی گئی۔ اب ذرا سگریٹ کا ایک کش لگا کر ذرا آرام کر لوں۔ تو پھر کام شروع کر دوں گا۔

(سامنے سے ایک بڑھیا آتی دکھائی دیتی ہے)

فرہاد۔ ہیں! یہ بڑھیا کون؟ یہ یہاں کہاں؟ اسے تو میں نے اپنی پیاری شیریں کے محل میں دیکھا تھا۔

میرا خیال ہے یہ ضرور کوئی پریم بھرا سندیسہ لائی ہے۔

فرہاد۔ (بلند آواز میں) کیوں مائی! میری شیریں کا پیغام لائی ہو۔

بڑھیا! (روتی آواز میں) بیٹے فرہاد ظلم ہو گیا؟

فرہاد:۔ (چونک کر) کیا ہوا سگریٹ ختم ہو گئے؟

بڑھیا:۔ نہیں بیٹا شیریں مرگئی۔

فرہاد:۔ (چیخ کر)

مرگئی، مگر وہ تو ابھی زندہ تھی۔

بڑھیا! ہاں بیٹا!! ابھی ابھی مرگئی ہے۔

فرہاد۔ پھر میری اس نہر کھودنے کا فائدہ!

بڑھیا:۔ کوئی فائدہ نہیں۔ اب تو شیریں کو کبھی نہیں مل سکتا۔

فرہاد:۔ (چیخ مارتا ہے) اور بے وفا دنیا! تو کتنی ظالم ہے۔ تو نے میری شیریں کو مجھ سے چھین لیا۔

لے اب میں بھی اس دنیا سے چلتا ہوں۔

(اتنا کہہ کر کلہاڑا اٹھاتا ہے۔ اور زور سے بڑھیا کے سر پر دے مارتا ہے۔ بڑھیا فوراً مر جاتی ہے۔ اور فرہاد خاک اڑتا جنگلوں کی راہ لیتا ہے)

لیجئے ناظرین:۔

قربانی کا ایک منظر ملاحظہ فرمائیں۔ دو عاشق، معشوق، ڈائیلاگ بول رہے ہیں۔"

عاشق:۔ پیاری نصیبن! میں تم پر دیوانہ وار فدا ہوں۔

نصیبن:۔ میاں کلن ہوش کی دوا کرو۔ میں تمہیں اپنے ساتھ کیسے لا سکتی ہوں۔

کلن: کیوں!

میں قد میں یا عمر میں تم سے چھوٹا نہیں۔

نصیبن:۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی کہ تم مجھ سے عشق کرو گے۔

کلن۔ تو پھر کیا تمہاری بکری سے عشق کرتا۔

نصیبن:۔ خاموش بدلگام! میں تمہیں آج تک اپنا بھائی سمجھتی رہی ہوں۔"

کلن:۔ (چونک کر) بھائی! آہ ظالم عورت یہ تو نے کیا کہہ دیا۔ تم میری بہن نہیں۔ ماں ہو۔

میں ان آنکھوں کو پھوڑ دوں گا۔

جنہوں نے تم پر بری نظر ڈالی۔لاؤ۔

مجھے سلائیاں لادو۔جلدی لادو۔اس وقت میں قربانی دینے کے دوڑ میں ہوں۔

(کلن فوراً سلائیوں سے اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالتا)

نصیبن:۔آہ یہ تم نے کیا کر دیا۔

میرا تو خیال تھا۔

کہ تم اپنے کان چھید دو گے۔مگر تم نے تو آنکھیں چھید لیں۔

کلن:۔اب جو کچھ ہوا ہے ہونے دو۔اب مجھے خدا نظر آ رہا ہے۔میں خدا سے ملنے جا رہا ہوں۔

(گانا گاتے ہوئے جنگلوں کی راہ لیتا ہے)

دے دے خدا کے نام پر بابا

ہمت ہے گر دینے کی

دیکھا آپ نے ناظرین! شہر کے لاہور کے سینما گھروں میں خدا پرستی اور بھلائی کے لئے نادار اور عجیب سبق پڑھائے جاتے ہیں۔

مگر۔یہ آپ کدھر چل پڑے۔

جنگل کی طرف! ارے خدا کے لیے واپس آ جایئے کل ناشتہ کر کے اکٹھے جنگلوں میں سچائی کی تلاش میں چلیں گے۔اگر سچائی نہ ملی تو جڑی بوٹیاں تو ضرور مل جائیں گی۔

......☆......☆......